مُجھے جینے کے سب ڈھنگ مِلے

ایم سُلطانہ فخر

"او ڈیم اٹ! یہ کیا حماقت ہے" عذر نے بائیں ہتھیلی پر رکھے بڑے سے سفید کاغذ پر دائیں ہتھیلی کی پشت کو زور سے مارتے ہوئے انتہائی کوفت کے عالم میں کہا۔

"یہ ــــ یہ شرائط ہیں یا تمہیں ڈی گریڈ کرنے کا کوئی حیلہ۔"

"نہیں خیر ڈی گریڈ کرنے کی تو اس میں کوئی بات ہی نہیں" مراد نے کہا۔

"ہیں، ڈی گریڈ کرنے کی کوئی بات نہیں پھر کیا تمہاری تاج پوشی کرنے کے سلسلے میں یہ انتہائی واہیات اور بے تکی قسم کی شرائط رقم کی گئی ہیں؟"

"یہ ــــ شرط نمبر ایک۔

نکاح صرف چھ افراد کی موجودگی میں پڑھایا جائے گا اور یہ مذکورہ چھ افراد لڑکے والے فراہم کریں گے۔

شرط نمبر دو۔

عروسی لباس سفید سادہ ساڑھی ہوگی، جو لڑکی کی طرف سے ہی ہوگی اور جیسی بھی ہوگی لڑکے کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

شرط نمبر تین۔

نکاح کے سلسلے میں طے کی گئی شرائط کے بموجب نکاح کے بعد لڑکی کی رخصتی نہیں ہوگی۔ لڑکی خود ہی کسی وقت لڑکے کے گھر پہنچ جائے گی۔

شرط نمبر چار۔

لڑکی کے گھر میں موجودگی کے اوقات میں اس لڑکے کو گھر میں رہنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ البتہ لڑکی کی غیر حاضری میں ــــ اماں لاحول ولا ــــ اس طرح تو

مجھے جینے کے سب ڈھنگ ملے

ایم سلطانہ فخر

تم ساری عمر رنڈوے ہی رہو گے۔ اچھا سچ سچ بتاؤ! یہ تمہارا کوئی مذاق تو نہیں جو ہمیشہ کی طرح مجھے بیوقوف بنانے کے لیے ہو؟“

• ”نہیں مذاق کیا، یہ تو زندگی کی ایک حقیقت ہے، بڑی ٹھوس حقیقت —“ مراد نے ملازمہ کے آتا ہی بڑھ گئے اور بھیجکے کا نوٹس لیے بغیر بڑی متانت سے کہا۔

• ”اُف وہاٹ! یعنی کہ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے، یہ سب تمہارا لغو قسم کا شرائط نامہ۔ کم از کم میرے لیے تو بڑی بے غیرتی کی بات ہوگی۔ یہ تمہارا ان بے ہودہ قسم کی شرائط کو منظور کر لینا۔“

• ”ہاں تمہارا کہنا کچھ غلط تو نہیں، لیکن میں بھی کیا کروں مجبوری ہی کچھ ایسی ہے۔“

• ”ہائیں تم اور مجبوری — تم تو بڑے ناک چوٹی گرفتار ظاہر کرتے تھے اپنے آپ کو۔“

• ”کرتا تھا ہی نہیں، بلکہ اب بھی ہوں۔“

• ”ہونہہ! وہ تو اس شرائط نامے کو قبول کرنے سے ہی ظاہر ہو رہا ہے کہ تم کتنے غیرت مند ہو۔ بھلا میں کہتا ہوں کہ اس لڑکی کے اندر ایسے کون سے لعل جڑے ہیں۔ کیا وہ یکتائے حسن ہے یا پھر اچھی لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے ملک میں جو تم — ایک دم ہی اُلو کی دُم فاختہ بن گئے ہو۔“

• ”اوہو بھئی! تمہارے ان سارے اندازوں میں کوئی ایک بھی درست نہیں ہے کیونکہ نہ تو یکتائے حسن ہے اور نہ میرے ملک میں لڑکیوں کا کال ہی پڑا ہے۔ البتہ لعل جڑنے کی بات اس کی حسنِ سیرت کو مدِنظر رکھتے ہوئے کسی حد تک فٹ بیٹھتی ہے یعنی وہ بہت سنجیدہ مزاج، سادگی پسند، اسٹریٹ فارورڈ دماغ کی، نیک سیرت، سرو قد اور اٹریکٹو قسم کی لڑکی ہے، جس نے میری عزیز از جان بیٹی جینیفر کے دل پر کچھ ایسا قبضہ کیا ہے کہ وہ اس لڑکی کا ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ سے اوجھل ہونا گوارا نہیں کرتی اور وہ بھی صرف جینی پر ہی جان چھڑکتی ہے۔ جب کہ تعجب کی بات یہ کہ وہ انتہائی اکل کھری [illegible] کی لڑکی ہے مگر —!“

• ”بس — بس — اگلی زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں یار، صاف صاف یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ اس کی یہ نہایت ہتک آمیز شرائط قبول کرنے میں تمہاری ایک بہت بڑی غرض شامل ہے یعنی تم اپنی بیٹی جینی کی خوشی کی خاطر یہ شادی کا جوا اپنے گلے میں ڈال رہے ہو۔ مگر یار! ایک چھوٹی سی معصوم بچی کو بہلانا کچھ اتنی مشکل بات تو نہیں۔ اس کام کے لیے تم ایک گورنس بھی رکھ سکتے تھے اور لندن میں بھی تو ایک انگریز گورنس اس پر مامور تھی۔ ویسے بائی دی وے یہ لڑکی ہے کون اور کیا کرتی ہے یعنی گھریلو ٹائپ ہے یا ملازمت پیشہ؟“

• ”وہ ایک مقامی کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے حال ہی میں اپائنٹمنٹ ہوئی ہے اور جینی کی خالہ [illegible] کی کزن ہے۔“

• ”اوہو! اگر کزن بھی ہوتی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ ملازمت تو کرتی ہے ناں۔ ان شرائط کو مان کر اسے بیوی کی زندگی گزروانے سے تو یہی بہتر ہوتا کہ تم اسے اپنے یہاں ایک تگڑی تنخواہ پر گورنس ہی رکھ لیتے۔“

• ”ہاں شروع میں، میں نے بھی کوشش کی تھی یعنی اپنی خوشدامن صاحبہ کے ذریعے یہی آفر دینی چاہی تھی، مگر خوشدامن صاحبہ تو ایک دم چھٹتے ہی اکھڑ گئیں، کہنے لگیں۔

• ”اسے روپے پیسے کی کوئی کمی تو نہیں ہے، جو وہ اتنی گھٹیا ملازمت کرے گی۔ وہ تو محض شوقیہ کالج میں ملازمت کر رہی ہے۔“

• ”اچھا تو گویا تمہاری خوشدامن صاحبہ بھی ان تمام بے ہودہ شرائط کے ساتھ اسے قبول کرنے پر تیار ہیں۔“

• ”ہاں بلکہ یہ انہی کا مشورہ اور خواہش ہے میرا مطلب ہے جینی کی وجہ سے۔“

• ”اوہ تو یوں کہو کہ اس معاملے میں بیٹی کی وجہ سے تم مجبور ہو گئے ہو۔ سچ دوست مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“ تنویر کے لہجے میں یکایک ہمدردی عود کر آئی۔

• ”ارے نہیں، میں تو بالکل بھی مجبور نہیں ہوں، بلکہ مجبوری کا لفظ میری زندگی کی لغت میں کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ میں تو اس بات پر [illegible]

خوش ہوں کیونکہ میں بھی یہی کچھ چاہتا ہوں۔“

• ”کیا — یعنی اس لڑکی کو اپنانا — وہ بھی ان احمقانہ شرائط کے ساتھ؟“

• ”ہاں — ہاں ان تمام اسٹوپڈ شرائط کے ساتھ بھی اور جتنی دور تک میں نے خود کو اندر سے ٹٹولا ہے، وہ ہر مقام اور ہر لحاظ سے مجھے اچھی لگی ہے۔ آئی لائیک ہر ویری مچ۔“

• ”اچھا! تو لائیک ہر دیٹ مچ، کہ وہ تمہارے اندر بھی اتر گئی ہے۔ یار! یہ تو بڑی تشویشناک سا انکشاف ہے۔ مجھے اس میں عشق کی ساری علامتیں یکجا نظر آرہی ہیں۔“

• ”ہاں یار! مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ آئی ایم فال اِن لو وِد ہر۔ میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔“

• ”ہائیں — فال اِن لو وِد ہر — ارے کہیں گھاس تو نہیں چر گئے تم، جو اب یہ کہہ کر مردوں کی ساری برادری کو ہرجائی صفت اور بھنورا صفت کا طعنہ دلواؤ گے اور کہاں گئے، وہ تمہارے مرحومہ مسز [illegible] سے محبت کے دعوے، وہ ان کے رحلت کر جانے کے بعد دوسری شادی نہ کرنے کا عہد، کیا وہ سب حرفِ زبانی جمع خرچ پر ہی محمول تھے، یعنی جھوٹے تھے؟“

• ”سنو یار! تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ صائمہ میرے بچپن کی مانگ تھی۔ گو یہ مانگ بزرگوں کی جانب سے تھی، پھر بھی میں اور صائمہ اس کی پاسداری کرتے رہے۔ ان دنوں روایات اور رواجوں کی پابندی کے ساتھ ساتھ بڑی اماں کی نگاہوں کا پہرہ اتنا کڑا ہوتا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے سے مل بھی نہیں سکتے تھے۔ بس ہمارے درمیان آنکھ مچولی ہوتی رہتی تھی۔ وہ سب کی نظر بچا کر میری طرف دیکھتی تو میری نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے شرما کر بھاگ جاتی یا چھپ جاتی اور میں اپنا جذبوں سے بھرا دل مسوس کر رہ جاتا۔

پھر ہماری شادی ہو گئی تو میں نے اسے وہ سب کچھ دے ڈالا، جو ایک چاہنے والا شوہر اپنی محبوب بیوی کو دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اولاد بھی۔ مگر اس بے چاری کی عمر نے وفا نہ کی۔ بچی کی پیدائش کے بعد چند پیچیدگیوں کی وجہ سے وہ ایسی بیمار پڑی کہ جانبر نہ ہو سکی اور اس کے انتقال کے بعد میں پورے ڈھائی سال تک اس سے کیے عہد اور وعدے پورے کرتا رہا۔ میں نے ایک سے ایک اچھا رشتہ ٹھکرا دیا۔ اپنے سارے کاروبار کو پسِ پشت ڈال کر اور ہزاروں روپے کا نقصان اٹھا کر اس کی چھوڑی ہوئی نشانی اور اپنی بچی جینیفر کی نگہداشت اور دلجوئی میں مصروف رہا مگر اب — اب یار — اب کیا نام دوں اسے، یہ جذبۂ دل یا جذبۂ عشق اس کی کارفرمائیاں بڑی شدید ہوتی ہیں۔ یہ مجھے اب جا کر معلوم ہوا ہے۔ وہ رشتہ تو بچپنے سے باندھا گیا ایک نازک سا رشتہ تھا، جس میں شوق تھا، چاہت تھی، لگن تھی، مگر یہ جذبہ۔“

• ”ارے جاؤ بدمعاش کہیں کے — قیس و فرہاد کے جانشین بننے کی کوشش نہ کرو — میں سب سمجھتا ہوں تمہاری چالوں کو، اب زیادہ میرا منہ نہ کھلواؤ، ورنہ کہہ دوں گا تو پھر سننے والے بھی —“

• ”کانوں میں انگلیاں دے لیں گے۔“ مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔

• ”ویسے تم کو اس پر آخر کیا اعتراض ہے۔ بھئی شادی تو میں اس سے کر رہا ہوں، زبردستی اسے تمہارے گلے تو نہیں منڈھ رہا۔“

• ”نہیں میرے گلے نہ سہی، اپنے گلے تو منڈھ رہے ہو۔ وہ بھی ایسی لغو شرائط کے ساتھ، بس مجھے اسی پر سخت کوفت ہو رہی ہے۔“

• ”ارے چھوڑو یار! کیسی شرائط اور کس کی شرائط، پہلے شادی تو ہو لینے دو۔ پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ [illegible] خود [illegible] کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔“

• ”اچھا تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے بڑی چالاکی سے اسے اپنے جال میں پھنسایا ہے۔“

• ”نہیں، نہ چالاکی برتی ہے اور نہ جال میں پھنسایا ہے۔ اصل میں بہت زیادہ لیے دیے رہنے والی بعض لڑکیاں جذباتی بھی ہوتی ہیں اور ناتجربہ کار بھی۔ کم از کم پریکٹیکل لائف کا تجربہ تو بڑی چیز، انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا ہے اور یہ لڑکی بھی کچھ ایسی ہی لڑکیوں

میں سے ہے۔ میرا مطلب ہے جب شادی ہوگی
، زندگی کا تجربہ آئے گا تو حالت یا پریکٹیکل ونف
کو سمجھنے کا شعور بھی آجائے گا تب ـــــ یہ ساری
شرائط ایک طرف دھری کی دھری رہ جائیں گی۔"
• بھئی واہ! بڑا داسٹ ایکسپیرینس رویا تجربہ)
رکھتے ہو۔ ہاں بھئی گھاٹ گھاٹ کا پانی جو پیا کھایا ہے
تم نے مگر بد قسمت سے زن مرید۔ میں بھی دیکھ
لوں گا کہ کہاں تک درست ہوتا ہے تمہارا یہ
کھوکھلا دعوا، ورنہ ناک سے تو ابھی سات لکیریں
کھنچوالی ہیں اس نے۔"
"ہاں، ہاں دیکھ لینا یار، پہلے شادی تو ہو لینے دو،
اچھا میں ذرا ایک شاور لے لوں پھر ـــــ" مراد نے
اس ذکر سے اکتا کر کہا، تو عذیر اٹھتے ہوئے بولا۔
"نہیں، نہیں میں اب چلتا ہوں۔ چار بجے میری
فلائٹ ہے۔ اب تو بحرین سے واپسی پر ہی ـــــ
ملاقات ہوگی، او کے اللہ حافظ!"
• اچھا بھئی جاؤ سدھارو بیٹا تمہیں اللہ کو سونپا۔"
مراد نے بزرگوں کے سے انداز میں الوداعی کلمات
کہے تو جاتے جاتے پلٹ کر عذیر نے اس کے سر پر
ایک دھپ لگایا اور پھر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔
عذیر سے مراد کی بہت پرانی دوستی تھی، مراد
کے سارے دوستوں میں وہی ایک واحد دوست تھا
جو مراد کا ہمراز بھی تھا اور ہمدرد بھی۔
مراد نے بعض نجی معاملوں میں اس سے مشورے
بھی لیتا تھا۔
عذیر پی آئی اے میں کیپٹن لگا ہوا تھا اور کبھی
ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتا تھا۔ اسے مراد کا یہ شرط
عقد ثانی، بلکہ عقد ثانی کے سلسلے میں لڑکی کی طرف سے
پر اتنی کڑی شرائط انتہائی لغو لگی تھیں اور بس وہ کی
پرواہ کیے بغیر اپنا ہونا تھا۔
مراد کو بھی اس کے جذبات کا پورا پورا احساس
تھا، مگر مراد بھی اپنی بیٹی کی وجہ سے سخت بے بس
ہو گئے تھے یا پھر اپنے دل کی وجہ سے۔ جب ہی تو
انہوں نے اپنے مقام سے گر کر نہ صرف یہ شرائط
منظور کرلی تھیں، بلکہ اب لڑکی کے سامنے بھی انہیں
وہ نبھانا چاہتے تھے، انہیں جھکنا پڑتا تھا۔

عذیر کے جانے کے بعد مراد شاور لینے کے
دوران اور اس کے بعد بھی تمام وقت انہی معاملات
پر غور کرتے رہے تھے۔ گو عذیر سے تو انہوں نے
بڑے دعوے سے کہہ دیا تھا کہ شادی کے بعد سب
کچھ ٹھیک کر لوں گا، مگر انہیں یہ کچھ اتنا آسان نہیں نظر
آرہا تھا، کیونکہ وقت کم تھا۔ یعنی شرائط منظور کرنے
کے بعد مزید سوچ بچار کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی
تھی۔ اس کے باوجود بھی وہ اسے رام کرنے کی تدبیریں
سوچ سوچ کر اپنا ذہن ماؤف کر رہے تھے۔ اسے شادی
پر ـــــ آمادہ کرنے کے لیے انہیں کتنے پاپڑ بیلنے
پڑے تھے۔ یہ بھی انہیں معلوم تھا۔
• لو ـــــ نو ـــــ یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا، یہ کسی طرح
ممکن ہی نہیں ہے۔" وہ اپنی کزن عظمت عرف ازی
کی پیش کش پر اس بری طرح چیخی، جیسے اچانک
چوٹ کھا لینے پر کوئی چیختا ہے۔
• مگر کیوں ممکن نہیں ـــــ آخر کیوں؟ جب کہ یہ
کوئی دنیا سے نرالی بات بھی نہیں ہے۔" ازی نے اس
کے اس قدر بھڑک اٹھنے پر ناگواری سے پوچھا۔
" تمہارے بیٹے نہ ہوئی مگر میرے کر لینے تو ہے۔ اور
کیا تم یہی سب کہنے کی غرض سے مجھے اس وقت اپنے
ساتھ لائی تھیں؟" وہ کچھ زیادہ ہی بھڑک کر بولی۔
• نہیں، خیر اس غرض سے تو نہیں لائی تھی۔ البتہ کسی
موزوں موقع کی تلاش میں ضرور تھی تاکہ تم سے اس
مسئلے پر گفتگو کر سکوں۔" ازی نے تھوک نگلتے ہوئے
کہا۔
• ہاں اور وہ موقع مجھے یہاں لا کر تم نے فراہم کر دیا۔
ایک ہی بات ہوئی ناں، لیکن تمہیں ایسی کیا دلچسپی ہے
اس مسئلے سے جو تم موقع کی تاک میں بیٹھی رہیں۔ کیا تعلق
ہے تمہارا آخر اس اتنے اسٹوپڈ معاملے میں خود کو
انوالو کرنے کا ـــــ"
• او ہو بھئی، میرا کیا انٹرسٹ اور تعلق ہو سکتا ہے
بھلا۔ میں نے تو محض جینی کی بہبود اور تمہارے اس
معصومے انسانی برادری کے مربوط سلسلے ضرورت
رواداری اور ہمدردی کے جذبے کے تحت کہا ہے۔"
کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ازی کے ان آخری
فقروں پر دل کھول کر قہقہہ لگاتی، مگر اس سمے تو غصے

اور کوفت کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔
جل کر بولی۔
• او ہو، اگر ایسی ہی رواداری اور ہمدردی کا جذبہ
تمہارے دل میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے تو تم ہی ان کے
حضور اپنی خدمات پیش کر دو۔"
• ضرور کر دیتی، اگر جینی مجھ سے اس قدر مانوس
ہوتی، جتنی تم سے ہے۔ پتا بھی ہے تمہارے اچانک
ہی طوطے کی طرح دیدے پھیر کر چلے آنے پر وہ تمہارے
ہجر کے میں بیمار ہو گئی ہے۔ بچے کا دل تو یوں بھی بہت
نازک اور کمزور ہوتا ہے۔"
• خیر، میں یہ سب نہیں جانتی۔ البتہ یہ ضرور جانتی
ہوں کہ تم سب مجھے بے وقوف یا پھر قربانی کا بکرا
بنانے پر تلے ہوئے ہو۔ ورنہ خود ہی سوچو کہ جینی نے
جب ماں سے بچھڑنے پر ہجر کا نہیں کیا تو میرے
چند دن کے ساتھ کا ہجر کا کیسے کر سکتی ہے، جب کہ میں
تو اس کے لیے بالکل غیر اور اجنبی تھی۔"
• نہیں ـــــ نہیں تم اس کے لیے بالکل غیر اور اجنبی
نہیں تھیں۔ تم نے تو اس بے چاری کو ماؤں جیسا پیار
ہی دیا تھا اور وہ معصوم اور ننھی منی بچی تو صرف چھ ماہ
کی تھی، جب صائمہ باجی کا انتقال ہوا تھا۔ اور میرا
خیال ہے کہ یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو۔"
• ہاں تمہاری زبان سے ہی سنا تھا، ورنہ میں نے
تو تمہاری صائمہ آپا کو کبھی دیکھا تک نہیں۔"
• خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بہت سی باتوں
سے واقف ہونا ہی بہت کافی ہوتا ہے اور کم از کم
جینی کی حالت زار تم سے ڈھکی چھپی تو نہیں۔ اتنا
تو تم نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ اتنے کم عرصے میں وہ
کس بری طرح تم سے مانوس ہو گئی ہے۔"
• اچھا ـــــ چھا اب جینی کو آڑ نہ بناؤ۔ اس کا مجھ سے
ملنا جلنا تو صرف چند ماہ کا ہے، مگر اس سے پہلے
دو برس تک وہ کس سے مانوس رہی تھی۔ ہونہہ خواہ مخواہ
آ لٹے سیدھے حوالے دینا۔"
• نہیں، میں حوالے تو نہیں دے رہی، وہ ننھی منی سی
معصوم بچی بڑی ڈل اور گری گری سی رہتی ہے، مزاج میں
بھی چڑچڑا پن پیدا ہو گیا ہے اور یہ ساری علامات
احساس محرومی کی وجہ سے ہی نظر آتی ہیں اس کے اندر

جبکہ مراد بھائی اس کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ انہوں
نے اس کی وجہ سے اپنی صحت پر بنا لی ہے، پھر بھی ماں
کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"
• اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر تمہارے مراد بھائی نے
دوسری شادی کر لی ہوتی۔ تاکہ جینی کے دل سے ماں
کی کمی کا احساس جاتا رہتا۔"
• لو بھلا سوتیلی ماں کب اتنا پیار دے سکتی ہے
سوتیلی اولاد کو، اور پھر مراد بھائی بھلا کیسے بھول سکتے
تھے صائمہ آپا کو۔ یوں بھی اتنا پیار اتنا تعلق تھا دونوں
کے درمیان۔"
• ہاں یہ تو وفاداری کا ثبوت دیا ہے تمہارے مراد
بھائی نے اور میں ان کے اس جذبے کو سراہتی ہوں
یوں بھی مجھے مطلبی، اور ہرجائی قسم کے مردوں سے
سخت نفرت ہے۔"
• مگر اپنی بکھری ہوئی شکست خوردہ سی زندگی کو
کسی نہج پر لانے کا مطلب ہرجائی پن اور مطلب
براری تو ہرگز ہو ـــــ نہیں۔ مراد بھائی کو بالآخر کسی نہ
کسی طور پر اس تجربہ ازنے کو سمیٹنا ہی پڑے گا، جو صائمہ آپا
کے اچانک رحلت کر جانے کی وجہ سے بکھر کر رہ گیا
تھا۔"
• افوہ! بھئی، کبھی کہتی ہو کہ وہ صائمہ آپا سے بے وفائی
کر ہی نہیں سکتے اور کبھی کہتی ہو کہ انہیں زندگی کے
بکھرے ہوئے شیرازے کو بہر طور سمیٹنا ہی پڑے
گا۔ جبکہ میں نے تو تمہاری پیشکش سنتے ہی مشورہ دیا
تھا کہ وہ جلدی سے دوسری شادی کر لیں، یوں بھی
اسمارٹ اور ڈیشنگ سے ہیں اور خاصے جوان بھی
لگتے ہیں، اچھے سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے انہیں۔"
• ہاں وہ تو مل ہی جائے گی، لیکن اگر میں یہ کہوں
کہ ان اچھی لڑکیوں میں سرفہرست تمہارا نام آتا ہے تو؟"
ازی کی اس بات پر وہ ایک دم ہی بھڑک اٹھی۔
• دیکھو اب بہت ہو گئی ازی کی بچی، اب اس سے
زیادہ میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔"
• افوہ بھئی اس میں اتنا برا ماننے کی کیا بات ہے یوں
بھی جہاں میری ہوتی ہے، وہاں تم تھر تھرتی ہو میں یہ
کوئی انوکھی بات تو نہیں۔"
• ہاں بالکل بھی نہیں ہے۔ وہ تمہارے گھر کے آنگن میں

"تو صرف بولی کہ یہ بڑا چھتنار درخت اُگا ہوا ہے یعنی تمہاری خالہ زادیں، ماموں زادیں اور تم ساری بہنیں، تم سب پر تو پتھر نہیں اینٹیں آتی ہوں گی اینٹیں۔" وہ جلے کٹے انداز میں بولی۔

تو اس کی بات پر ازی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہا ہا ہا — اینٹیں! ویسے تمہاری اطلاع کے لیے اتنا بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ بیری پر اینٹیں نہیں پتھر مارے جاتے ہیں وہ بھی چھوٹی چھوٹی ٹھیکریاں یا کنکریاں۔"

"ہونہہ! کنکریاں یا ٹھیکریاں، اب بات بنانے کی کوشش نہ کرو۔ اتنا ہی شوق ہے نا اپنے بہنوئی کی شادی کرانے کا تو اپنی وہ جو آٹھ دس کزنز ہیں، اُن میں سے کسی سے کرا دو۔"

"لیکن جہاں تک شادی کرانے کا معاملہ ہے تو آٹھ دس کزنز بھی کیا، مراد بھائی کو ان کے علاوہ بھی ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت لڑکی مل سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی کہوں گی کہ ساری بات پسند کی ہوتی ہے۔ اور حسنِ اتفاق سے وہ تمہیں منتخب کر چکے ہیں۔" ازی نے دبی زبان سے آخری فقرہ کہا۔

"کیوں! کیا تیرے اندر سرخاب کے پر لگے ہیں یا پھر ہیرے لعل جڑے ہیں۔ اصل میں تم بڑی بہن ہو۔ اپنی بات بنتی نہیں، دیکھی تو فوراً اپنے بہنوئی کا نام لے دیا۔" وہ سخت برہمی کے عالم میں بولی۔

"نہیں یہ بات نہیں، بلکہ ——"

"ارے چھوڑو بلکہ وکہ —— یاد تو کہہ رہی تھیں کہ بہت پرانا تعلق تھا صائمہ آپا کا تمہارے مراد بھائی سے، وہ ان کی یاد کو دل سے بھلا ہی نہیں سکتے۔ بے وفائی کے مرتکب نہیں ہو سکتے یا پارسائی کا یہ عالم کہ ان کی نظرِ انتخاب سیدھی مجھ پر ہی پڑی۔ میں خوب سمجھتی ہوں ازی یہ بھی کوئی چال ہے، جو تم میرے خلاف چل رہی ہو۔ مجھے بے وقوف بنا کر کسی چکر میں پھنسانا چاہتی ہو۔"

"ارے نہیں، نہیں مائی ڈیئرسٹ کزن خدا کی قسم۔ ایسی تو دور تک بھی کوئی بات نہیں۔ میں بھلا تمہیں کسی چکر میں پھنساؤں گی۔ اس سے پہلے میرا ڈیپارچر نہ ہو جائے جو میں ایسا سوچوں بھی۔" ازی نے اوپر آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آخری فقرہ کہا۔

وہ جو ازلی کی ذرا ذرا سی بات پر ہنسنے کی عادی تھی سپاٹ سا چہرہ لیے بیٹھی رہی۔

"دیکھو ہنی! تم کم از کم مجھ سے تو بدگمان ہونے کی کوشش نہ کرو، ویسے بائی دا وے کیا تم یہ بتا سکتی ہو کہ تم کس جذبے کے تحت جینی پر اتنی مہربان ہو گئی تھیں کہ تم نے سگی ماں کو بھی پیچھے بٹھا دیا تھا۔ اسے ایک پل بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دینا، اپنے ساتھ سُلانا، اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلانا، نہلانا دھلانا اور اس کا لباس تبدیل کرنا، حتیٰ کہ وہ پو[illegible] پر بیٹھی تھی تو ——؟"

"اچھا —— اچھا بس اب اتنی اسٹوپڈ بات کو نہ جتاؤ، تم جاننا چاہ رہی ہو تو سنو —— میں نے تو یہ سب کچھ محض ہمدردی اور خدا ترسی کے جذبے کے تحت کیا تھا، ورنہ تم کو تو معلوم ہی ہے کہ میرا تو دور تک اس بچی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تو میں اتفاق سے یہاں چھٹیاں گزارنے آئی ہوئی تھی، بچے مجھے ہمیشہ سے پسند ہیں۔ جینی خود ہی مجھ سے کمبل ہو گئی تو میں نے بھی اس کا خیال رکھنا شروع کر دیا اور بس۔"

"واہ —— اور بس! یعنی اس سے آگے کچھ نہیں۔ واہ بھئی بڑے سنگدلانہ فیصلے ہوتے ہیں تمہارے اور اِدھر وہ بے چاری معصوم سی بچی ہے کہ ہر دم تمہارے نام کی ہی مالا جپتی ہے۔ ہنی آنٹی —— ہنی آنٹی —— ہنی آنٹی کو بلاؤ۔ حتیٰ کہ رات کو بیڈ پر لیٹتے ہی سُلانے کی ہزار کوشش کرو، مگر وہ کمرے میں چاروں طرف متلاشی نظروں سے دیکھ دیکھ کر تمہیں ہی پکارتی رہتی ہے۔"

"اچھا! تو کیا تم رات کو جینی کے بیڈ روم میں ہوتی ہو؟" اس نے معنی خیز سے انداز میں پوچھا۔

"نہیں، میں تو وہاں نہیں ہوتی، وہ بے چارے مراد بھائی ہی بتاتے رہتے ہیں۔ سچ سخت ڈپریشن کا شکار ہو رہے ہیں آج کل وہ بے چارے۔"

"اُفوہ! اتنی ہی ہمدردی ہے تو پھر تم خود کیوں اُن سے شادی نہیں کر لیتیں۔ ویسے بھی جینی تمہاری سگی خالہ زاد کی بیٹی ہے۔ تم جتنا اس کا خیال رکھو گی، کوئی اور تو رکھ ہی نہیں سکے گا۔"

"ہائیں میں؟" عظمت نے تھوک نگل کر کہا۔

"میں تو سب سے پہلے اپنی خدمات پیش کر دیتی بشرطیکہ مراد بھائی مجھے پسند کرتے۔ مگر وہ تو تمہیں پسند کرتے ہیں، صرف تمہیں۔"

ازی کی اس بات پر وہ ایک دم ہی بھڑک اٹھی۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو اور کس چارم میں کہہ رہی ہو کہ وہ مجھے پسند کرتے ہیں صرف مجھے جب کہ میرا تو اُن سے ایک دو بار صرف آمنا سامنا ہی ہوا ہے تعارف تک تو نہیں ہوا۔ ہونہہ نہ جان نہ پہچان۔"

"مراد خان سلام۔" ازی نے دخل در معقولات کرتے ہوئے نعرہ لگایا تو وہ ایک دم ہی اَپ سیٹ ہو گئی۔

"او —— ڈیم اِٹ! میں خوب سمجھتی ہوں —— تم اصل میں اپنے کسی ذاتی مفاد کی خاطر یہ سارا چکر چلا رہی ہو مگر اچھی طرح کان کھول کر سن لو ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ ناممکن ہے۔"

بات کے اختتام پر ازی کا جواب سننے اور اس کی طرف دیکھے بغیر اپنا پرس اٹھا کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے باہر نکلنے لگی تو سامنے ہی دروازے کے نزدیک ڈائننگ ٹیبل کے آگے رکھی ریوالونگ چیئر کو تیزی سے اس کی طرف گھما کر مراد نے سنجیدگی سے لہجے میں کہا۔

"اگر یہ آپ کے خیال میں ممکن نہیں تو پلیز —— ممکن بنانے کی کوشش کریں۔"

اور کرسی کے اچانک گھومنے اور مراد کو اس پر بیٹھا دیکھ کر ہنی کو کچھ ایسا شاک سا لگا کہ چند ثانیے تو ہلنے جلنے کے بھی قابل نہیں رہی۔ مگر پھر کچھ ہی دیر بعد سخت غیظ و غضب کے عالم میں وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور اس کے جانے کے بعد ازی جو مراد کو کمرے میں موجود دیکھ کر چند ثانیے ورطۂ حیرت میں غوطے لگاتی رہی تھی۔ تیزی سے اُٹھ کر مراد کے قریب آ گئی اور بڑی ناگواری سے بولی۔

"آپ یہاں کب سے بیٹھے تھے مراد بھائی اور کیوں بیٹھے تھے۔ کیا آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں تھا جو سارے کے سارا پلان ہی غارت کرا دیا۔ اب تو وہ کسی قیمت پر بھی میری کوئی بات نہیں سنے گی۔ ویسے بھی یہ بڑی اور نامناسب حرکت کی ہے آپ نے، کم از کم میں آپ سے ایسی امید نہیں کر سکتی تھی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ڈیئر سسٹر! اور آپ کی یہ خفگی بھی حق بجانب لیکن آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس جینی کی وجہ سے سخت ڈپریشن کا شکار ہو گیا ہوں، اس لیے بہت مجبور ہو کر اس وقت مجھے اپنے مقام سے گرنا پڑا ہے۔ محض اسے یہ جتانے کے لیے کہ میں بھی اس کی ذات میں دلچسپی رکھتا ہوں۔"

بُرا ماننے کے بجائے مراد نے نہایت ملائمت سے گویا عظمت کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن مراد بھائی! آپ نے جلد بازی سے کام لے کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ کیونکہ آپ ہنی کی فطرت سے واقف نہیں ہیں۔ وہ جس چیز کے لیے ایک مرتبہ انکار کر دیتی ہے، اس کے لیے اقرار کرانا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ یوں بھی میں نے آپ کی طرف سے اسے یہی تاثر دیا تھا کہ آپ دوسری شادی کے معاملے میں اتنے سیریس نہیں ہیں کہ جیسے آپ نے خود دخل دے کر اپنا انٹرسٹ دکھا دیا۔ اگر آپ اس معاملے میں نہ بولتے تو میں کسی نہ کسی طرح بہت کچھ سن کر اسے راضی کر لیتی، لیکن مجھے افسوس ہے کہ اب میں اس معاملے میں آپ کی مدد کرنے سے قاصر ہی رہوں گی۔"

ازی ایک دم جیسے بپھر سی گئی تھی۔ اس نے گویا اس معاملے سے دستبردار ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا! پھر تو جو قسمت میں لکھا ہو گا اور جیسا حالات اجازت دیں گے، دو ماہ بعد لندن سے میری واپسی پر ہی ہو گا، اچھا خدا حافظ۔"

مراد نے اٹھتے ہوئے کہا اور فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گئے۔

اور ازی پشیمان ہی نہیں، پریشان سی ہو کر سوچتی رہ گئی کہ اس نے اتنے سخت لہجے میں کیوں اپنے بہنوئی سے گفتگو کی۔ جبکہ جینی کی وجہ سے ہم سب اُن سے خوشامدانہ سے انداز میں بات کرتے تھے۔

خالہ بیگم تو داماد کی خاطر میں بچھ بچھ جاتی ہیں خاص طور پر اس لیے کہ وہ جینی کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہیں تاکہ وہ سوتیلی ماں کی بدسلوکی کا شکار نہ بن سکے جبکہ

خالہ بیگم کے ان بے سروپا اندیشوں پر ہم دل ہی دل میں خوب ہنستے تھے کہ بھلا مراد بھائی بھی کہیں دوسری شادی کر سکتے ہیں۔

صائمہ آپا کی محبت اور جینی کی ذات نے تو بُری طرح انہیں جکڑ رکھا ہے۔ انہیں دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف جینی کی پرداخت ہو۔ اپنے اتنے اعلیٰ پیمانے پر قائم شدہ بزنس کو بھی انہوں نے پس پُشت ڈال رکھا ہے لیکن خالہ بیگم کے اندیشے درست ہی ثابت ہوئے۔ انہوں نے واقعی صائمہ آپا کی محبت کو پسِ پشت ڈال کر ہنی کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔

اُف! کیا سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں؟

اپنی غرض کے پُتلے۔

بے مروّت۔

بے وفا۔

مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ نہیں۔

مراد بھائی نے یہ فیصلہ بہت مجبور ہو کر کیا ہے۔ صرف اور صرف جینی کی زندگی بنانے کے لیے۔

ویسے بھی بقول خالہ بیگم کے، "وہ ایک عورت کے لیے اپنی زندگی تیاگ کر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اب نہیں تو آئندہ کبھی جلد یا بدیر مراد کو اپنا گھر بسانا ہی پڑے گا۔"

اسی لیے مرحوم بیٹی کی ماں ہو کر بھی خالہ بیگم یہ چاہتی تھیں کہ مراد بھائی عقدِ ثانی کر لیں اور وہ انہیں سمجھا بجھا کر جینی کو اپنے پاس رکھ لیں۔ حالانکہ سگی نانی ہونے اور اپنی تمام تر شفقتیں نچھاور کرنے کے باوجود بھی جینی ان سے اتنی مانوس نہیں ہوئی تھی۔ بس ان کے پاس آ کر کچھ دیر کے لیے تو بہل جاتی، مگر پھر آنکھیں بند کر کے جو رونا شروع کرتی تو سارے گھر کو سر پر اٹھا لیتی اور جب اس پر ایسی کیفیت طاری ہوتی تو وہ اپنی ضد کے آگے مراد بھائی کو بھی نہیں گردانتی تھی اور ادھر گھر کے تمام افراد بشمول اس کی بہنیں اور کزنز جینی کو بہلانے اور چپ کرانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالتے مگر وہ کسی کے قابو میں ہی نہیں آتی تھی اور بیٹی کا رونا اور مچلنا مراد کی کمزوری تھا سو وہ اتنے بدحواس ہو جاتے کہ ان کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کریں تو کیا کریں، پھر مچلتی اور بلکتی ہوئی جینی کو گود میں اٹھا کر گھر سے باہر نکل جاتے اور اسے کار میں بٹھا کر کہیں جاتے تو گھنٹوں بعد واپس آتے۔ یعنی اسی صورت میں جب جینی کا موڈ ٹھیک ہو جاتا اور وہ رونا دھونا اور مچلنا بند کر دیتی۔

یہ صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ مراد بچی کی وجہ سے کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنا کاروبار بھی نہیں سنبھال سکتے تھے۔ جو دن بدن ٹھپ ہوتا جا رہا تھا۔ وسیلۂ رزق تو اصل میں یہی کاروبار تھا۔ اسی لیے وہ کچھ زیادہ فکرمند رہنے لگے تھے بلکہ گھر کے تمام افراد ہی اپ سیٹ سے ہو گئے تھے۔

خالہ بیگم کی صرف دو ہی بیٹیاں تھیں۔ شوہر تو بچیوں کی صغر سنی میں انتقال کر گئے تھے۔ خالہ بیگم شوہر کی طرف سے چھوڑے ہوئے ترکے میں جو مکان تھا اسی میں رہتی آئی تھیں۔ اسی گھر سے انہوں نے دونوں بیٹیوں کو رخصت کیا تھا اور بعد میں بھی وہیں رہتی رہی تھیں، مگر جب جواں سال بیٹی صائمہ کا انتقال ہوا تو عظمت کی امی جو ان کی منجھلی بہن تھیں ان کے غم کو ہلکا کرنے کی غرض سے انہیں زبردستی اپنے گھر لے آئیں اور تب سے خالہ بیگم انہی کے یہاں رہ رہی تھیں۔

چھوٹی خالہ جو انڈیا میں رہائش پذیر تھیں۔ انہوں نے اپنی جوان بیٹیوں کو وہاں سے حالات کی ابتری کے پیشِ نظر عظمت کی والدہ کے پاس بھیج دیا تھا۔ چنانچہ وہ تینوں بہنیں وجیہہ، عاتکہ اور عرشیہ بھی ازی کے یہاں ہی اقامت پذیر تھیں۔ خود ازی کی بھی تین بہنیں اور تھیں، جن میں سے سب سے بڑی بہن شادی شدہ اور اولاد والی تھی۔ خالاؤں اور ماموؤں کی شادیاں خاندان میں ہی ہوئی تھیں، اس لیے مراد سے بھی ان کا قریبی رشتہ ہوتا تھا۔ جب کہ ہنی سے مراد کی رشتہ داری تو کجا، دور کی بھی واقفیت نہیں تھی۔

اصل میں ہنی عظمت کے رشتے کے ایک چچا کی بیٹی تھی، جس سے عظمت کی ملاقات بھی کبھی برسوں کی برسات میں وہ بھی خاص خاص موقعوں پر ہوا کرتی تھی، البتہ بچپن سے لے کر بلوغت کی عمر میں قدم رکھنے تک دونوں ایک ہی اسکول میں تعلیم پاتی رہی تھیں۔ حتیٰ کہ دونوں نے میٹرک بھی ایک ساتھ ہی کیا تھا اور ہنی اور ازی کے درمیان دوستی بھی جب ہی سے قائم تھی حالانکہ ازی کئی برس سے کراچی میں رہ رہی تھی، مگر دونوں کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہتی تھی اور ازی اپنے تقریباً ہر خط میں اسے بڑی شدّت سے اپنے یہاں آنے کی دعوت دیتی تھی۔ مگر ہنی اپنی چند مجبوریوں کی وجہ سے چاہنے کے باوجود اس کی دعوت قبول نہیں کر سکی تھی۔ مگر تو کچھ حالات نے ہی ایسا موقع فراہم کیا کہ ہنی کو بڑی مجبوری کے تحت کراچی آنا ہی پڑا۔

اصل میں کراچی کے ایک کالج میں اسے لیکچرر کی پوسٹ مل گئی تھی۔ گو ابھی موسمِ گرما کی تعطیلات ختم نہیں ہوئی تھیں۔ لیکن چونکہ ایک گرلز ہوسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست بھی ہو گیا تھا اور ہنی اپنے ساز و سامان سمیت وہاں پہنچ بھی گئی تھی۔ مگر دو تین روز بعد جب عظمت کو پتا چلا کہ وہ کراچی کے ایک ہوسٹل میں رہائش پذیر ہے تو وہ اپنی امی کے ساتھ جا کر زبردستی اپنے گھر لے آئی تھی۔

یوں بھی اتفاق سے چونکہ تعلیمی ادارے موسمِ گرما کی تعطیلات کی وجہ سے ان دنوں بند تھے، اس لیے ازی کے یہاں اس کا قیام طویل ہو گیا تھا جس کی ایک وجہ تو بچیوں اور کزنز کا اصرار تھا اور دوسری اور سب سے بڑی وجہ معصوم اور پیاری بے ماں کی بچی جینی کی موجودگی تھی۔

اب یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ جب عظمت اور اس کی امی کے بہت اصرار پر ہنی ان کے یہاں رہنے آئی تو مراد بھی چند روز پیشتر جینی کو نانی سے ملوانے لندن سے آئے ہوئے تھے۔

اصل میں ملوانے کا تو محض بہانا تھا جینی کی ذمہ داری ان کے لیے ایک مسئلہ بن گئی تھی کیونکہ جو گورنس لندن میں انہوں نے جینی کی دیکھ بھال کے لیے رکھی تھی، اس کی شادی ہو گئی تھی اور وہ ہنی مون منانے یورپ چلی گئی تھی۔ جینی اس سے بہت مانوس تھی۔ مراد نے اس کے لیے دوسری گورنس کا انتظام بھی کیا تھا مگر جینی نے اسے بالکل قبول نہیں کیا۔

ادھر جینی کی وجہ سے مراد کے کاروبار میں خلل پڑ رہا تھا۔ اس پر ان کی ساس جب بھی ان سے فون پر بات کرتیں، ان سے یہی کہتیں کہ میری نواسی کو تو محبت ملوا جاؤ بیٹے، میں نے تو اسے اپنی صائمہ کے انتقال کے موقع پر ہی دیکھا تھا۔ اب تو میری آنکھیں ترس گئی ہیں اسے دیکھنے کو۔۔۔ تو کچھ اسی وجہ سے بھی۔ بلکہ خاص طور پر اس خیال سے کہ نانی اور خالاؤں کے پاس بچی کا دل لگ جائے گا اور وہ بہل جائے گی۔

وہ جینی کو کراچی لے آئے تھے جبکہ کراچی آنے کے بعد ان کا یہ خیال خام ہی نکلا تھا۔ جینی، نانی اور خالاؤں کے پاس کچھ دیر تو بہلی رہتی پھر ایکدم ہی بے چین ہو جاتی اور بات بات پر ضد کر کے رونے مچلنے لگتی تھی۔ اور پھر سوائے مراد کے کسی کے قابو میں نہ آتی تھی۔ نانی آخر روہ صبر کر گئیں۔

"اس ننھی سی جان کے لاشعور میں ماں سے محرومی کا احساس جم کر رہ گیا ہے، اس لیے یہ ماں کا متلاشی کرتی ہے۔ بے چاری بچی منہ سے تو کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

اس پر مراد کہتے "یہ نہیں امی جان! صائمہ کے انتقال کے وقت تو یہ کل چھ ماہ کی شیر خوار بچی تھی اسے بھلا مالِ محرومی کا احساس کیسے ہو سکتا ہے۔ اصل میں تو یہ ڈورس کا شر کیا کرتی ہے، جو صائمہ کے انتقال کے بعد اب تک اسے سنبھالتی رہی تھی۔"

بہرحال، مراد تو یہ سوچ کر آئے تھے کہ جینی کو نانی کے پاس چھوڑ کر لندن واپس جا کر اپنا کاروبار سنبھالیں گے، مگر جینی کا موڈ دیکھ کر کراچی میں ہی رکنے پر مجبور ہو گئے تھے اور سخت گومگو کی کیفیت میں تھے کہ کریں تو کیا کریں۔ کیا جینی کو اپنے ساتھ لندن واپس لے جائیں یا پھر اسے ساس کے پاس چھوڑ جائیں جبکہ دونوں صورتیں ہی غیر امکانی سی لگ رہی تھیں یعنی نہ تو جینی کو لندن واپس لے جانا ممکن نظر آ رہا تھا نہ ہی ساس کے پاس چھوڑنا۔

تب ہی ایک روز ہنی ان کی ساس کے یہاں چند روز گزارنے کی غرض سے آئی۔ اس کے بلانے

پر جینی یوں لپک کر اس کی گود میں آ گئی جیسے ہنی اس کی سگی ماں ہو۔
جینی کی اس حرکت نے سب کو ہی حیرت میں ڈال دیا۔ ہنی کو بھی چھوٹے صحت مند بچے اور خوبصورت بچے بہت پسند تھے۔ اس نے بچی کو سینے سے لگا لیا اور ادھر ادھر ٹہل کر گنگنانے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد جینی کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ گہری نیند سو گئی۔

ہنی نے نیند قدرے پکی ہو جانے پر اسے آہستہ سے اس کے بستر پر لٹا دیا اور پلٹ کر جانے لگی، تو جینی نے پٹ سے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنی توتلی زبان میں اسے پکارا۔
"ممی!"
ازی اس کے پاس ہی کھڑی تھی، ہنس کر بولی۔
"لو بھئی، اس نے تو تمہیں ممی بھی بنا لیا۔"
اور وہ جو جلدی سے پلٹ کر جینی کے پاس بیٹھ گئی تھی ازی کے فقرے کی گہرائی کا نوٹس لیے بغیر بولی۔
"ہاں تو پھر بے چاری اور کیا کہہ سکتی ہے۔ اتنی چھوٹی سی تو ہے اور چھوٹے بچے سب سے پہلے ممی ہی کہنا سیکھتے ہیں۔"
اس نے تو بظاہر لاپرواہی سے یہ بات کہہ دی تھی مگر ازی کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا تھا۔ مگر صرف جھماکا ہی۔ اس سے آگے سوچنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا تھا کیونکہ جینی پھر ہنی کی گود میں سوار ہو چکی تھی اور اس کے گلے میں اپنی ننھی ننھی باہیں ڈالے آہستہ آہستہ پیر ہلا کر ایک ٹک اس کے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔
"وہ کتنی شریر ہے۔ یہ چاہ رہی تھی کہ میں اسے گود میں لیے رہوں۔" ہنی اس کے سنہرے گھنگھریالے بالوں کو چوم کر بولی۔
"ارے ذرا انداز تو دیکھو تو، ایکدم ہی کتنی فری ہو گئی تم سے ۔۔۔ اور دیکھو اس طرح دیکھ رہی ہے جیسے تمہیں پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔" ازی نے کہا۔
تو اس کی خالہ زاد عائکہ نے کہا۔
"مگر صائمہ آپی شکل و صورت کے اعتبار سے تو ان سے بالکل ہی مختلف تھیں۔"
تو اس کی بڑی بہن وجیہہ نے اسے گھور [...] کہا تھا۔
"تم بھی کمال کرتی ہو عائکہ، اس بے چاری [...] ماں کو دیکھا ہی کہاں ۔۔۔ کل چھ ماہ کی ہی تو تھی [...] صائمہ آپی کا انتقال ہوا تھا۔"
اسی اثنا میں جینی نے ہنی سے چمٹ کر اس [...] کے شانے پر چہرا ٹکا لیا تھا اور ہنی اس کی پیٹھ [...] آہستہ آہستہ تھپک رہی تھی۔
"مجھے تو تعجب اس بات پر ہے کہ ہم تو [...] کر لیتے تھے مگر یہ جینی ہماری گود میں نہیں آتی [...] اور تمہارے پاس بن بلائے ہی چلی آئی۔ آخر تم [...] آتے ہی ایسا کیا جادو کر دیا ہے۔" اس پر جو [...] ہنی، ازی کی بات کاٹ کر بولی۔
"ارے نہیں ازی! یہ بات نہیں۔ اصل [...] بچہ نگاہ اور رویے کو پہچانتا ہے۔ میرا مطلب [...] جس کی نگاہ اور رویہ اسے پسند آ جاتا ہے [...] بس اسی کی طرف جھک جاتا ہے۔"
"تو بھلا ہم اس پر کتنی جان چھڑکتے ہیں کس قدر [...] کے ناز اور چونچلے اٹھاتے ہیں، مگر یہ کسی طرح ہمیں [...] گردانتی ہی نہیں۔" ازی کی چھوٹی بہن عصمت بولی۔
"ہاں یہ بات واقعی تعجب خیز ہے۔ اچھا بھئی [...] چلو گڑیا اب آرام سے بستر پر لیٹ جاؤ۔ چلو اپنا [...] ہے تو میں یہیں تمہارے پاس بیٹھ کر تمہیں سلا دوں گی۔ چلو شاباش، گڈ گرل۔"
ازی نے عصمت کی بات کا جواب دے کر باقی فقرے چٹکیاں بجاتے ہوئے رسان سے بستر پر لٹا کر اسے تھپکا تو کچھ دیر بعد وہ واقعی گہری نیند سو گئی اور یہ بات بھی تقریباً سارے ہی اہل خانہ کے لیے سخت اچنبھے کا باعث تھی کہ ایک تو ضدی سی جینی اتنی آسانی سے ہنی کے قبضے میں آ گئی تھی۔ دوسرے وقت سے پہلے ہی سو گئی تھی جبکہ اسے سلانا بھی ایک کارِ دارد ۔۔۔ ہی ثابت ہوتا تھا۔ نانی اور خالائیں ہر طریقے سے اسے سلانے کی کوشش کرتیں لیکن وہ کسی طرح سو کر ہی نہیں دیتی تھی۔ آخر مراد کو خود ہی سلانا پڑتا تھا، جو اپنے دوست احباب کے ساتھ وقت گزار کر رات کو اکثر دیر میں آتے تھے۔

اس روز ایک اور غیر معمولی بات یہ ہوئی کہ چونکہ جینی وقت سے پہلے سو گئی تھی، اس لیے اس نے دودھ بھی نہیں پیا تھا۔
نانی کو اس بات کا بہت افسوس تھا کہ بچی بھوکی ہی سو گئی ہے اور اس ڈر سے کہ دودھ پینے پر وہ ڈسٹرب ہو کر کہیں رونے اور چلانے نہ لگے۔ انہوں نے اسے بھوکا ہی سلانا بہتر سمجھا تھا، لیکن ہنی نے ان کے منع کرنے کے باوجود اس کا فیڈر منگوایا اور سوئی ہوئی جینی کے قریب بیٹھ کر اس کے منہ سے لگا دیا۔ تھوڑا سا ہلایا جلایا اور چمکارا، تو جینی نے فیڈر منہ سے لگایا اور آہستہ آہستہ دودھ پینے لگی۔
اور یہ بات تو تعجب خیز ہی نہیں، ناقابل یقین ہی ثابت ہوئی ان سب کے لیے۔
پھر یوں ہوا کہ جینی چند ہی روز میں ہنی سے اتنی مانوس ہو گئی کہ زیادہ تر اسی کے پاس گھسی رہتی۔ کبھی اس کی گود میں چڑھ جاتی اور کبھی اس کی انگلی پکڑ کر اس کے ساتھ گھومتی۔ اس نے ضد کرنا اور رونا دھونا بھی بالکل چھوڑ دیا تھا۔ خود ہنی کو بھی بے ماں کی اس ننھی سی بچی سے اتنی انسیت ہو گئی تھی کہ وہ زیادہ تر اسی پر توجہ دیتی تھی۔
جینی کے لیے ایک آیا بھی رکھی ہوئی تھی جو اسے نہلاتی دھلاتی اور پاٹی صاف کرتی، کپڑے بدلواتی مگر صرف اسی صورت میں جب جینی کا موڈ اسے اپنا کام کرانے کا ہوتا تھا۔ ورنہ تو وہ رو رو کر اور مچل مچل کر گھر سر پر اٹھا لیتی تھی۔ ادھر مراد اس کو اتنا چاہتے تھے کہ اگر اس کے منہ سے ایک ہلکی سی سسکاری بھی نکل جاتی تو بے چین ہو اٹھتے تھے اور آیا کو سختی سے ممانعت کر دیتے تھے کہ بچی کی مرضی کے بغیر اس کا کوئی کام نہ کرے، مگر ہنی نے اس مسئلے کو بھی حل کرا دیا۔
وہ جینی کے سامنے آیا کو ڈانٹ کر کہتی۔
"آیا! تم نے ہماری گڑیا کو اتنا گندا ڈریس کیوں پہنا رکھا ہے، چلو اسے نہلا کر دوسرا ڈریس پہناؤ!"
آیا حکم کی تعمیل میں فوراً کھڑی ہو جاتی۔ پھر وہ وارڈروب سے بچی کے کپڑے نکالتی ۔۔۔

اور ہینگر سے فراک اتارتی ہوئی تولیہ اس کے ہاتھ سے لے کر کہتی۔

"لاؤ، تولیہ مجھے دو، اور بے بی کو نہلاؤ۔ میں تولیہ سے اس کا جسم پونچھوں گی۔"

اب پتا نہیں دو سالہ جینی اس کی بات سمجھ پاتی نہ سمجھتی مگر ایک دو بار اس کی شکل دیکھ کر چپ چاپ نہا لیتی۔ نہانے کے بعد ہی اسے تولیے میں لپیٹ کر اسے ڈریسر کے بنچ پر کھڑا کر دیتی اور اسے اچھی طرح پونچھ کر پوڈر میں نہلا دیتی۔ اسی اثنا میں آیا اسے لباس پہنا دیتی۔ پھر بے بی سوفٹ برش سے اس کے گھنگریالے بال سنوار کر اسے گود میں اٹھا کر خوب پیار کرتی۔ اور سب سے کہتی۔

"دیکھو کتنی کیوٹ لگ رہی ہے ہماری گڑیا۔ کتنی خاموشی سے نہا کر کپڑے بدلوا لیے ہیں اس نے۔ یہ تو بالکل نہیں روتی۔ گڈ گرل۔"

"ہاں واقعی یہ بھی تمہاری ذات کا کمال ہے۔ میں پھر یہی کہوں گی کوئی منتر وغیرہ پڑھ کر پھونک دیا ہے تم نے اس بچی پر۔ ورنہ یہ تو نہاتے وقت اپنے باپ کے قبضے میں بھی نہیں آتی۔" ازی بولی۔

"پھر وہی جاہلانہ خیال۔ بھلا میں کیا کوئی جادوگرنی ہوں جو منتر وغیرہ پھونکوں۔ بس یہ بچی شاید مجھے پسند کرنے لگی ہے، اس لیے میری بات مان لیتی ہے۔" اس نے عظمت کی بات پر چڑ کر کہا۔

"لیکن میں جس نتیجے پر پہنچی ہوں وہ یہ ہے کہ اس بچی نے اپنی ماں کو تو دیکھا ہی نہیں ہے۔ البتہ چھ ماہ کی عمر سے دو سال کی عمر تک اپنی برٹش نژاد گورنس کے پاس رہی ہے۔ اور جہاں تک مجھے یقین ہے آپ کے اندر اس کی گورنس سے کچھ مشابہت ہوگی۔ بس اسی وجہ سے جینی آپ سے اتنی اٹیچڈ ہو گئی ہے۔" عائلہ نے پھر اپنا فلسفہ جھاڑا۔

"ارے نہیں عائلہ تم بھی کیسی عجیب باتیں کرتی ہو کہ اس برٹش گورنس کو مجھ سے ملا رہی ہو۔ بھلا کہاں وہ فیئر کمپلیکشن سنہری رنگت والی انگریز عورت اور کہاں میں سانولی سی گندمی کمپلیکشن کی لڑکی۔"

"واقعی بھئی اب خدا کی اتنی ناشکری بھی ٹھیک نہیں ہوتی۔ کہ اتنی اچھی بھلی صاف شفاف رنگت کو کالا دیکھ رہی ہو۔" ازی نے فوراً ہی اسے خدا کی ناشکر گزاری کا احساس دلایا۔

"ہاں واقعی۔ نہ صرف رنگت ہی صاف اور اجلی ہے بلکہ ناک نقشہ بھی ایسا تیکھا کہ دیکھنے والے پر پہلی نظر میں ہی قیامت ڈھا دے۔" عائلہ کی بڑی بہن وحیدہ نے ہنس کر کہا۔ تو خدا کی ناشکری ہو جانے کے احساس سے گڑبڑا کر اس نے کہا۔

"نہیں نہیں توبہ میں ناشکری تو نہیں کر رہی۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ ڈورس مجھ سے کہیں زیادہ گوری اور خوبصورت ہوگی۔ مگر پتا نہیں ہوگی بھی یا نہیں۔" اور اس کے اس طرح گڑبڑا کر بات کو الٹ پلٹ کرنے پر ایک قہقہہ پڑا۔ اس پر اس نے جھینپ کر کھسیانے ہوتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو اچھا بھئی، میں نے بھی اب کان پکڑے جو میں جینی کی طرف دیکھ بھی لوں۔ تم لوگوں کی تو وہی مثل ہے کہ نیکی کر کنویں میں ڈال اور پھر میں تو تمہارے اصرار پر آئی تھی۔ ایک دو روز بعد تو چلی ہی جاؤں گی۔" وہ کچھ فطرتاً زود رنج تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر برا مان جاتی تھی۔ وہ سب اس کو منانے اور اس کی خوشامدیں کرنے لگیں۔

"ارے نہیں نہیں، ہم تو مذاق کر رہے تھے بھئی۔"

"اصل میں ہم پر حیرتوں کے پہاڑ جو ٹوٹ رہے ہیں نا بہنی۔ تمہارے ساتھ جینی کا رویہ دیکھ کر، ورنہ ہم تو اس کے سگے ہیں۔ ایسی ڈراؤنی شکلیں بھی نہیں ہیں ہماری۔ اور اس بچی پر اپنی تمام تر محبتیں نچھاور کرتے ہیں مگر یہ ایک نمبر کی ضدی اور بے مروت ہے۔ ذرا سی بات پر ہم سے آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ بس ہم اسی وجہ سے الٹی سیدھی قیاس آرائیاں کر لیتے ہیں۔ پلیز بہنی تم ہماری باتوں کا برا نہ مانو۔" ازی گویا اپنی صفائی میں بولی۔

"کمال ہے ازی۔ تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے جینی کوئی بہت عقلمند اور بڑی سی بچی ہو۔ یہ بے چاری تو صرف دو سال کی بچی ہے۔ اور لاشعوری طور پر ماں کی محرومی کا شکار ہے۔ ازی شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ماں کی گود کی گرمی۔ اس کے نرم سینے کی ٹھنڈک۔ اور ممتا کا لمس۔ اور گداز۔

ماں کے وجود کی وہ ٹھنڈی اور گھنیری چھایا۔ یہ سارے لطیف احساسات ایک بچہ ماں کے پیٹ سے ہی لے کر پیدا ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں وارد ہوتے ہی ماں کے سائے سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی لاشعوری طور پر ان ساری محرومیوں کو محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک فطری بات ہوتی ہے ڈیئر کزن۔ اور جینی خوش قسمت ہے کہ اسے باپ کا اتنا زیادہ لاڈ اور پیار نصیب ہے۔ تمہارے بہنوئی اس کی ہر ضد پوری کرتے ہیں۔ بس اسی وجہ سے اتنی ضدی ہو گئی ہے۔"

"بھئی واہ۔ تم تو واقعی بچوں کی سائیکالوجی میں ماہر ہو۔" وحیدہ ایک ٹھنڈا سانس کھینچ کر بولی۔

"اور آئندہ کے لیے یہ ایک خوش کن بات ہے۔ بلکہ ہم سب کے لیے۔" ازی نے معنی خیز سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہائیں وہاٹ! کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ اس کی مسکراہٹ پر چونک کر بولی۔ تو ازی نے جلدی سے بات بنائی۔

"بھئی، یہ تم سے ایسی کام کی باتیں معلوم کرنا جن سے ہم یکسر نابلد ہیں۔"

بہرکیف وہ آئی تو تھی عظمت کے یہاں چند دن گزارنے کی غرض سے ارادے سے (اس لیے نہیں کہ ازی اور اس کی والدہ صغریٰ بیگم اسے زبردستی اپنے ساتھ لائی تھیں) مگر اسے ازی کے یہاں رہتے دس بارہ روز ہو گئے تھے۔ اور ان دس بارہ دنوں میں وہ زیادہ تر جینی کے ہی چاؤ چونچلوں میں لگی رہی تھی۔ اور جب بھی ہوسٹل جانے کا ارادہ ظاہر کرتی عظمت وغیرہ یہی کہتیں۔

"بھئی آتے اپنی مرضی سے ہیں۔ اور جاتے ان لوگوں کی مرضی سے ہیں جن کے یہاں رہنے آتے ہیں۔"

اس پر وہ ہنس کر کہتی۔

"مگر میں اپنی مرضی سے تو یہاں نہیں آئی تھی۔ بلکہ زبردستی لائی گئی تھی۔"

"تو اب جاؤ گی بھی اسی طرح۔ ویسے ایسی کون سی گھر گرہستی چھوڑ کر آئی ہو جو تم پر جانے کا فکر سوار رہتا ہے۔ ابھی تو کافی چھٹیاں باقی ہیں۔ بس کالج کھلنے سے دو تین روز پہلے چلی جانا۔" اور صغریٰ بیگم کہتیں۔

"ہاں اس طرح جینی کچھ دن تو بہلی رہے گی۔ مجھے تو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ تمہارے جانے کے بعد وہ ہمارے قبضے میں نہیں آئے گی۔"

"چچی جان آپ خالہ اماں سے کہیں کہ میری موجودگی میں ہی جینی کا چارج سنبھال لیں۔ میرے سامنے اسے فیڈ دیں۔ خود اپنے ہاتھوں سے نہلائیں دھلائیں۔ پھر فیڈر بھی آپ کریں۔ گود میں لے کر گھومیں۔ تو میں دعوے سے کہتی ہوں کہ جینی مجھے بھول کر ان کی ہو جائے گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر آپا بیگم کو غموں نے ادھ موا سا کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کی صحت خراب رہتی ہے۔ وہ جینی کو بھلا تم جیسی جوان بچیوں کی طرح کیسے سنبھال سکتی ہیں۔" صغریٰ بیگم نے جواب میں کہا۔ تو وہ ٹھنڈا سانس لے کر بولی۔

"ہاں پھر تو واقعی جینی ان کے لیے ایک مسئلہ ہی بنی رہے گی۔ گھر میں اور کسی سے بھی وہ اتنی مانوس نہیں ہے۔ میرے خیال میں بہتر یہی ہوگا کہ آپ مراد صاحب کے ساتھ اسے لندن واپس بھیج دیں۔"

"سارا مسئلہ تو یہی ہے بیٹی کہ مراد میاں بچی کو اپنے ساتھ لندن تو نہیں لے جا سکتے، کیونکہ وہاں تو اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی ہوگا ہی نہیں۔ اور اسی وجہ سے تو مجبوراً اسے یہاں لے کر آئے ہیں۔"

اس کی چچی صغریٰ بیگم نے کہا تو وہ خاموش ہو گئی کہ اب بھلا وہ اس مسئلے کا حل کیونکر تلاش کر سکتی تھی۔ یوں بھی اس معاملے سے اس کا دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ بلکہ وہ تو دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی کہ اس نے جینی کو خود سے اتنا اٹیچڈ کیوں کیا کہ وہ تو زبردستی اس کے گلے ہی پڑ گئی۔

بہرحال وہ مستقل طور پر تو ازی کے یہاں رہنے نہیں آئی تھی۔ بلکہ جس دن سے آئی تھی رسیاں تڑا رہی تھی مگر ان سب کے اتنے بے پناہ خلوص اور محبت نے نہ چاہتے ہوئے اسے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ادھر اس کے آ جانے سے اور خاص طور پر جینی کو اس سے اتنا اٹیچڈ دیکھ کر جینی کی تائی تھیں بیگم نہ صرف خوش بلکہ مطمئن بھی تھیں۔ وہ برابر دیکھ رہی تھیں کہ جینی جو ایک ممی کے سوا کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی کسی خالہ کی گود میں ہوتی ہے اور اس پر نظر پڑ جاتی ہے تو چیخ چیخ کر اور رو رو کر اس کی گود میں جانے کی ضد کرتی

ہے۔ اور ایسے موقعوں پر ہنی اسے بہت دلار سے کھاتی ہے۔

"نہیں بُری بات کر دیا۔ یہ بھی تمہاری امی ہیں۔ تمہاری سگی خالہ۔ تم ان کے پاس ہی رہو۔ ورنہ میں تم سے خفا ہو جاؤں گی۔"

ننھی سی دو سالہ جینی خواہ اس کی بات سمجھتی یا نہ سمجھتی مگر خاموش ضرور ہو جاتی۔ اور اس کے پاس آنے کی ضد بھی چھوڑ دیتی۔

نصیرہ بیگم کہ پہلے بہو کی اور پھر جوان بیٹی کی جدائی کا زخم کھائے ہوئے تھیں پھر بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتیں کہ داماد اگر ہنی کو اپنا لے تو جینی کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو جائے گا۔ جبکہ اس معاملے میں داماد سے کچھ کہنے کا حوصلہ اس لیے نہیں پڑتا تھا کہ وہ داماد کی مرحومہ بیوی کی ماں تھیں اور سب سے بڑھ کر انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ داماد کو عقدِ ثانی کرنے کا تصور بھی گوارا نہیں۔ اور ادھر داماد صاحب تھے کہ جن کی خدمت میں ان کی سالیاں ہنی کے بارے میں ایک ایک رپورٹ پیش کرتی رہتی تھیں۔ ان کے لیے بھی سب سے زیادہ اچنبھے کی بات یہ تھی کہ جینی ہنی سے اتنی زیادہ مانوس کیسے ہو گئی۔

ہنی اس گھر میں اکیلی رہی تھی جس گھر میں ان دنوں وہ بھی عارضی طور پر مقیم تھے۔ مگر سسرال میں زیادہ وقت گزارنا مناسب نہیں لگتا تھا۔ اس لیے زیادہ تر گھر سے باہر اپنے دوست احباب کے ساتھ ہی وقت گزارتے تھے۔ شاید اس وجہ سے بھی صرف ایک دو بار ہی ہنی سے ان کا سامنا ہوا تھا۔ وہ بھی بڑا لمحاتی قسم کا۔ یوں بھی اس وقت تک تو ان کے دل میں بھی کوئی ایسا ویسا خیال نہیں آیا تھا۔

ادھر ایک دن اچانک ہی اپنے کاروبار کے سلسلے میں لندن سے ضروری کال آ گئی تھی۔ انہوں نے سوچا جینی کا دل بہلانے کے لیے ہنی تو موجود ہی ہے۔ کل چار پانچ روز کا معاملہ ہے۔ کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ لندن ہو آئیں۔ گھر میں انہوں نے کسی کو بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ الله کی مصلحت میں، جس میں مطمئن تھے ٹکٹ کٹا کر لندن کی فلائٹ پکڑ لی۔ گھر میں مراد کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ بات ہونی الله وقت آگے بڑھنے لگا۔ اور مراد گھر نہیں لوٹے تو سب ہی کو تشویش ہوئی۔ آخر، ارکے بھائی نے ان کے دوست کے گھر جاکر معلوم کیا تب

معلوم کیا تو اصل حقیقت کا پتا چلا۔ اب سب کو ایک نئی فکر پڑ گئی تو اگر جینی نے باپ کو غائب پا کر وہ رات کو ان کے پاس سوتی تھی، رونا اور چلانا شروع کیا تو اسے کیونکر بہلایا جائے گا۔

لیکن ہنی نے یہ کہہ کر ان سب کی پریشانی دور کر دی کہ آپ لوگ فکر نہ کریں بے بی کو میں سنبھال لوں گی۔ اور واقعی اس نے بچی کو کچھ اس طرح سنبھالا کہ مراد کی واپسی تک ایک دن بھی بچی نے باپ کو یاد نہیں کیا۔ اور اس بات پر تو سب دنگ رہ گئے تھے۔ جبکہ وہ خود بچی کی ذمہ داری اپنے سر لے کر بہت پچھتا رہی تھی۔ کیونکہ چھٹیاں ختم ہونے میں آٹھ دس روز ہی رہ گئے تھے۔ اور وہ چاہ رہی تھی کہ وہ خود کو ہوسٹل میں ایڈجسٹ کرنے کے لیے چند روز وہاں کے ماحول، اصول اور ضوابط سے آگاہ ہو جائے۔ مگر مراد جب لندن سے لوٹ کر آئے تو تین چار روز ہی رہ گئے تھے، تعلیمی ادارے کھلنے میں۔ اور وہ نہایت عجلت میں اپنا بستر بوریا سمیٹ کر اسلام آباد ہوسٹل چلی آئی تھی۔ اور اس کی پھپھی صغیرہ بیگم ملول اور پچھتاتی ہی رہ گئیں۔

ہر وقت جینی کی طرف متوجہ رہنے کی وجہ سے انہیں اس کا حال احوال معلوم کرنے کا بھی موقع نہ مل سکا تھا۔

ہنی کے جانے کے بعد جینی پھر اپنی پرانی ڈگر پر آ گئی۔ اس نے وہی بات بات میں ضد کرنا اور رونا دھونا شروع کر دیا۔ ادھر مراد بھی بیٹی کے اپ اینڈ ڈاؤن موڈ کو دیکھ کر اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ ہنی ان کے دل کو بُری طرح بھا گئی تھی۔ اس کی غیر موجودگی کو اس بُری طرح محسوس کر رہے تھے کہ اپنی مرحومہ بیوی سائمہ کی کمی کو بھی اتنا محسوس نہیں کیا ہوگا۔ مگر وہ ہنی کے معاملے میں بڑے مجبور تھے۔ کہ نہ اس پر کسی قسم کا کوئی دباؤ ڈال سکتے تھے نہ اپنی ساس اور خیا ساس کے سامنے اپنے دل کی بات کہہ سکتے تھے کہ سائمہ کے انتقال کے غم میں انہوں نے تو کسی دوسری عورت کا تصور نہ کرنے کی بھی قسم کھائی تھی۔ کجا کہ کسی دوسری عورت کو لائف پارٹنر بنانا۔ اب بھلا وہ کس منہ سے اپنی ساس یا سالیوں کے سامنے یہ کہہ سکتے تھے کہ میں ہنی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کبھی دل چاہتا خود جا کر ہنی سے بات کریں۔ مگر یہ آسان ہی کیا

سرسری نظروں سے دیکھا تھا وہ بھی ذرا کی ذرا۔ اور جب غور سے دیکھا تھا، تب بھی ان کے دل میں اسے اپنانے کی خواہش بالکل نہیں جاگی تھی۔

یہ تو کچھ سالیوں کے منہ سے ہنی کی تعریفیں اور بالخصوص جینی کو اپنے قابو میں کر لینے کا کارنامہ جینی کا اس سے گھل مل جانا۔ اور سب سے بڑھ کر اپنی سات دن کی غیر حاضری میں جینی کا انہیں بھول جانا۔ اس پر انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ جینی کی نگہداشت پر کسی ملازمہ کو رکھنا اب بیکار ہی ہوگا۔ بس انہی ساری باتوں یا پریشانیوں کے پیشِ نظر ان پر ہنی کو اپنانے کا بھوت سوار ہوا تھا۔ ان دنوں وہ زیادہ تر اپنے رہائشی کمرے میں ہی گھسے رہتے تھے۔ دوستوں کے یہاں آنا جانا بھی انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔

وہ تو کچھ قدرت ہی ان پر مہربان ہو گئی۔ وہ بھی کچھ اس طرح کہ نصیرہ بیگم ہنی کے چلے جانے سے جو خلا محسوس کر رہی تھیں۔ اس نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر ہنی کی شادی مراد سے کرا دی جائے تو ان کے اور مراد کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً جینی کا مسئلہ جو ان کے لیے اب دردِ سر بن گیا تھا۔ ہنی کے جانے کے بعد جینی نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ وہ دودھ بھی کم ہی پیتی تھی۔ وہ بھی باپ سے خوشامد درآمد کرنے کے بعد۔ وہ اتنی چڑچڑی ہو گئی تھی کہ ذرا سی بات پر رونے لگتی تھی۔ مراد نے امپورٹڈ قیمتی کھلونوں کا اس کے گرد ڈھیر لگا دیا تھا۔ مگر جب اس پر ضد سوار ہوتی تو وہ سارے کھلونے اٹھا کر پھینک دیتی۔ اور اگر کوئی خالہ ہنی کے حوالے سے کوئی بات کہتی تو وہ پہلے سُن سی ہو کر اس کی صورت دیکھتی پھر زور زور سے رونے لگتی۔ ان ساری باتوں نے نصیرہ بیگم کو بالآخر مجبور کر دیا کہ وہ داماد سے اس کے عقدِ ثانی کی بات کریں۔ حالانکہ ان کا دل زخموں سے چُور تھا۔ اور داماد سے اس موضوع پر بات کرنا ان کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ مگر کیے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ اس لیے پہلے تو انہوں نے اپنی بیٹی اور بھانجیوں کو اس بات کے لیے ہموار کرنا شروع کیا۔ اور وہ یہی کہتی رہیں کہ مراد میاں میری مرحومہ بیٹی کا خواہ کتنا ہی سوگ منائیں۔ کتنا ہی غم کریں۔ مگر ہیں آخر مرد ہی وہ

سکتا۔ وہ بھی ان پریشانیوں میں جن سے آجکل وہ دوچار ہیں۔ یعنی جینی ہمارے ساتھ رہ سکتی ہے نہ ان کے ساتھ۔ کیونکہ اب وہ ہر وقت اسے سنبھالنے سے تو رہے۔ اور سب ان کی بات کی تائید کرتے۔ اور ان کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ حالانکہ تلاش کرنا تو کیا ان کے پاس اس مسئلے کا حل بھی موجود تھا۔ کیونکہ ہنی کے جانے کے بعد نصیرہ بیگم نے یہ موضوع نکالا تھا۔ مگر کچھ سائمہ کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ ہنی کسی قیمت پر بھی اس رشتہ کو قبول نہیں کرے گی۔ وہ دل کی بات دل ہی میں لیے رہ جاتے۔

لیکن جب کچھ دن بعد نصیرہ بیگم نے کئی ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنے کے بعد کہا۔

"اے کاش مراد میاں ہنی کے لیے ہی ہامی بھر لیں کیسی پیاری بچی ہے۔ اخلاق آداب عادتوں اور شکل صورت میں بھی یکتا۔ اس پر پڑھی لکھی بھی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر جینی تو اس کی ایسی گرویدہ ہے کہ اسے دیکھ کر کھل اٹھتی ہے۔"

"ارے آپا جان آپ نے تو ٹھیک میرے دل کی بات ہی کہہ دی۔ میری تو شروع سے ہی یہ خواہش ہے کہ ہنی سے مراد کی شادی ہو جائے۔"

عظمت کی والدہ صغیرہ بیگم نے بہن کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے امی جان مگر بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟" عظمت جو اتفاق سے وہیں موجود تھی عجیب سے تیکھے انداز میں بولی۔

"اے لو بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کا بھلا کیا سوال۔ اسے یہ کوئی اتنی مشکل یا ناممکن بات تو نہیں ہے۔ مراد میاں کو دوسری شادی کے لیے آمادہ کرنا۔" اس کی امی کے بجائے اس کی خالہ نے جواب دیا۔

"ہاں واقعی۔ مراد کافی سمجھدار اور سلجھے ہوئے بردبار سے انسان ہیں۔ ہنی کی اہمیت کا اندازہ تو انہوں نے بھی لگا لیا ہوگا۔ اب انہیں سمجھا بجھا کر راضی کرنا آپا جان کا ہی کام ہوگا۔"

ارنی کی امی نے کہا تو ارنی جز بز سی ہو کر بولی۔

"اوہو امی جان ہیں مراد بھائی کی نہیں بلکہ ہنی کی بات

کہ ہنی مراد بھائی سے شادی کرنے پر ہرگز ہرگز راضی نہیں ہو گی۔"

"ارے بھلا کیوں نہیں ہو گی۔ اگر مراد میاں رنڈوے بھی ہیں تو خیر سے ابھی جوان ہیں۔ چونتیس سال کی عمر ہے ان کی جبکہ یہاں تو مرد ساٹھ سال کا ہو کر بھی جوان اور پٹھا کہلاتا ہے۔" نفیسہ بیگم چمک کر بولیں۔ تو ازری نے بھی ٹھنک کر کہا۔

"یہ یہاں سلجھنے اور الجھنے کی بات نہیں ہو رہی خالہ اماں۔ بلکہ ہنی اتنی چھوٹی عمر سے ہی جو تلخ تجربات اٹھاتی رہی ہے۔ ان کے پیش نظر وہ بہت پہلے ہی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔"

"اے لو یہ اور ہوئی۔ اسے وہ اتنی خود مختار کیسے ہو گئی جو شادی نہ کرنے کا فیصلہ بھی کر بیٹھی کیا اس کے سر پر کوئی بزرگ یا بڑا نہیں ہے۔" نفیسہ بیگم نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

"نہیں آپا جان، یہی تو اس بے چاری کی بدنصیبی ہے کہ بزرگوں کے موجود ہوتے ہوئے بھی اس کے سر پر کوئی بڑا نہیں ہے۔ اسی لیے بے چاری نے کسی طرح رو پیٹ کر پڑھ لکھ کر اب ایک کالج میں لیکچرر کی ملازمت سنبھالی ہے۔ اور اتفاق سے یہ ملازمت یہاں کراچی کے کالج میں ملی ہے اسی وجہ سے تو وہ یہاں نظر بھی آ گئی ورنہ بچپن سے لے کر اب تک تو پنڈی میں ہی گزر بسر ہوتی رہی ہے اس کی۔" ازری کی والدہ نے نفیسہ بیگم کو بتایا۔

"اللہ امی جان آپ تو ایسے بے چاری بے چاری کہہ رہی ہیں جیسے وہ کوئی لاوارث اور مفلس لڑکی ہو۔ جبکہ اس کی مالی پوزیشن تو ہم سے زیادہ مستحکم ہے وہ تو محض وقت گزاری کے لیے یہ سروس کر رہی ہے۔" ازری نے کہا۔

"خیر اگر اس کی مالی حیثیت اچھی بھی ہے، تب بھی دوسری شادی وہ بھی رنڈوے اور صاحب اولاد مرد جیسے شخص کی شادی کے معاملے میں لڑکی کی حیثیت وغیرہ نہیں دیکھی جاتی۔ بعض مرد تو کہتے ہیں مطلقہ ہو یا بیوہ انہیں ایک بیوی کی ضرورت ہے۔ اور ہنی تو خیر سے کنواری لڑکی ہے۔ میں بھی دیکھوں گی کہ مراد کیسے اس کے رشتے کو رد کرتے ہیں۔" نفیسہ بیگم بولیں۔

"اللہ خالہ اماں! بالفرض محال اگر مراد بھائی رضامند بھی ہو جاتے ہیں تو ہنی کبھی راضی نہیں ہو گی، کسی قیمت پر بھی نہیں۔ اور میں یہ بات ابھی آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔"

"ارے چھوڑو بہن! یہ سب تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے مراد کا عندیہ تو لینے دو، ارے بھئی شادی بیاہ کے معاملے میں سب سے اہم بات لڑکے کی مرضی ہی ہوتی ہے۔ اگر وہ انکار کر دے تو خواہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے بات بن کر ہی نہیں دیتی۔ خیر میں آج رات کو ہی مراد میاں سے اس معاملے میں گفتگو کروں گی۔"

نفیسہ بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ تو ازری سر جھٹکنے کے ساتھ ساتھ کندھے اچکا کر خاموش ہو گئی۔ پھر اسی رات نفیسہ بیگم نے مراد سے عقد ثانی کے بارے میں بات کی۔ مراد کی تو وہی مثل تھی، اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ وہ تو پہلے ہی ساس سے بات کرنے کے لیے موقع ڈھونڈ رہے تھے۔ اب ساس نے خود یہ ذکر چھیڑا بلکہ ان کو مشورہ دیا کہ وہ اب عقد ثانی کر لیں۔ وہ بھی ہنی کے ساتھ تو بظاہر تو انہوں نے انکسار اور بے اعتنائی سے کام لیا مگر دل میں ان کے لڈو ہی پھوٹنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ جب ہنی کالج میں سروس کر رہی ہے تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ جینی کی گورنس کی حیثیت سے میرے یہاں کام کرے میں اسے اس کا ڈبل معاوضہ دینے کو تیار ہوں۔" ان کی اس بات پر ساس نے انہیں لتاڑا۔

"اے کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹے۔ ہنی کے پاس ماشاءاللہ روپے پیسے کی کیا کمی ہے۔ وہ تو محض دل بہلانے کی غرض سے ملازمت کر رہی ہے۔ اب بھلا میں اس سے یہ کہوں کہ جینی کی گورنس بن جاؤ تو وہ یہی سوچے گی کہ یقیناً میرا دماغ چل گیا ہے۔ اور بیٹے اگر سچ پوچھتے ہو تو میں تو اس سے اس معاملے میں کچھ کہہ ہی نہیں سکتی۔ خیر سے اپنی ازری سے اس کی دوستی ہے اور سگی رشتے داری بھی۔ وہی اس معاملے کو آگے بڑھا سکتی ہے بشرطیکہ تم راضی ہو جاؤ۔"

تو مراد نے کچھ دیر سوچنے کی ایکٹنگ کرنے کے بعد آہستہ سے کہا۔

"گو میرے لیے یہ ایک ناممکن سی بات ہے پھر

بھی میں اس معاملے پر غور کر کے ہی کسی نتیجے پر پہنچوں گا۔ میرا مطلب ہے میں آپ کو جواب دوں گا۔"

اور نفیسہ بیگم دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی اپنے کمرے میں آ گئیں کہ چلو داماد نے سوچ کر جواب دینے کا تو کہا ہے۔ انہوں نے آتے ہی بہن اور بھانجی کو تمام بات بتا دی۔ اور ازری کو تاکید کر دی کہ وہ اس معاملے میں مراد کو کریدے۔ مگر ازری نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ "خالہ اماں مراد بھائی کے کسی نتیجے پر پہنچنے یا نہ پہنچنے سے کیا ہوتا ہے جب تک ہنی اس معاملے کے لیے ہامی نہ بھرے اور جس کے بارے میں مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کبھی راضی نہیں ہو گی۔"

"لو بھلا تم نے تو پانی سے پہلے ہی پال باندھ دی۔ ورنہ تم ہنی کی سہیلی ہو، تم اسے سمجھا تو سکتی ہو۔ یوں بھی یہ ایک کار ثواب ہی ہو گا۔ ہنی کی وجہ سے میری بے چاری ننھی سی نواسی کی زندگی تو سنور جائے گی۔ ورنہ مراد نے کسی رنگروٹی کو ڈال لیا تو میری جینی کی مٹی ہی پلید ہو جائے گی۔ جینی بیٹی سے تمہارا مراد سے زیادہ قریبی رشتہ ہوتا ہے۔ اور تم بھی تو جینی کو بہت عزیز رکھتی ہو۔ وہ تمہاری مرحومہ بہن کی نشانی بھی تو ہے۔ بس اسی کی خاطر ہنی کو راضی کر لو۔"

خالہ کے آخری فقرے پر ازری کا دل چاہا چیخ چیخ کر کہے کہ میں آپ سے کس طرح کہوں اور کونسی زبان میں کہوں کہ ہنی مر کر بھی راضی نہیں ہو گی۔ مگر اس نے کہا تو صرف اتنا کہا۔

"ٹھیک ہے خالہ اماں، مگر مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں، لیکن آپ کہہ رہی ہیں تو ہنی سے بات کر کے دیکھوں گی۔"

ادھر مراد نے ساس سے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ چند روز بعد کسی نتیجے پر پہنچ کر انہیں جواب دیں گے۔ جبکہ انہیں ہنی کے بارے میں ماسوا اس کے کہ وہ ازری کی چچا زاد بہن ہے۔ اور کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ خاص طور پر شادی کے بارے میں اس کے خیالات کیا ہیں۔ اور کیا وہ ان سے شادی کرنے پر آمادہ بھی ہو جائے گی۔ بس ان پر تو ایک دھن سی سوار ہو گئی تھی۔ ہنی کو اپنانے کی۔ اور اس دھن میں جینی کے بہانے ہی جانے کا خیال زیادہ کارفرما تھا۔ ساس سے یہ بھی نہیں پوچھ سکے تھے کہ ہنی ان سے شادی کرنے پر آمادہ بھی ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ سوال کر کے وہ خود کو ساس کی نظروں میں گرانا نہیں چاہتے تھے کہ وہ شروع سے ہی یہ ظاہر کرتے رہے تھے کہ دوسری شادی کا تصور بھی گویا ان کے لیے حرام ہے۔ چنانچہ انہیں ازری ہی وہ واحد ہستی نظر آئی جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سکتے تھے۔

ازری خود سخت الجھن میں تھی۔ خالہ نے اس معاملے کو آگے بڑھانے پر زور دیا اور ایک طرح اس کے اوپر ایک ذمہ داری سی ڈال دی تھی۔ مگر خواہش کے باوجود وہ ہنی کے پاس نہیں جا سکی تھی۔

ایک روز جب جینی کو اس کی پرام میں بٹھا کر اس کی آیا لان میں ادھر ادھر گھما رہی تھی۔ ازری لان میں تیسرے پہر بیٹھی اپنا کوئی مضمون یاد کر رہی تھی۔ اور اتفاق سے تنہا تھی۔ مراد بھی موقع غنیمت جان کر گنگناتے کے سے انداز میں ٹہلتے ہوئے اسی کی طرف چلے آئے۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" انہوں نے اپنی کیفیت چھپانے کے طور پر پوچھا۔

"او یقیناً مراد بھائی۔ آپ تو واقعی بہت تکلف سے کام لیتے ہیں، ورنہ بھلا پوچھنے اور اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔" ازری اپنے بہترین اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"او تھینکس۔ اصل میں آپ پڑھ رہی تھیں ناں۔ میں نے سوچا کہیں آپ ڈسٹرب نہ ہوں۔" ازری کی بات ایسی کوئی جواب طلب نہ تھی مگر مراد نے دانستہ سلسلہ کلام جاری رکھنے کی غرض سے کہا۔

"جبکہ میں جانتا ہوں کہ میری بیٹی ـــ نے تو پہلے ہی آپ سب کو ڈسٹرب کر رکھا ہے۔"

"ارے نہیں مراد بھائی یہ ہمارے لیے کوئی غیر تو نہیں اپنی ہی بچی ہے۔ ہم تو الٹا اس کے ڈسٹرب ہونے پر بے چین ہو اٹھتے ہیں۔ اور خالہ اماں بے چاری تو آپ کی غیر موجودگی میں ایک منٹ کے لیے بھی اس کے پاس سے نہیں ہلتیں کہ کہیں کسی بات سے ناخوش ہو کر یہ رونے نہ لگے بے چاری بچی۔" ازری نے جینی کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"ہوں۔" مراد نے ایک گہرے سانس کا اختتام

ہنکارے پر کیا۔ اور بولے۔
"مجھے تو تعجب اس بات پر ہے کہ ابھی پچھلے دنوں جب مجھے لڑکے کے جلنے کا اتفاق ہوا تھا تو میرے بغیر پارٹنر چھ روز اتنی خاموشی سے رہ لیے گئی۔ جبکہ اس کے خیال سے میں تو وہاں اتنا اپ سیٹ رہا تھا کہ اپنا کام بھی توجہ سے نہیں کر سکا تھا۔ اور اُدھر حنی اماں بتا رہی تھیں کہ اس نے سارا عرصہ بڑے آرام سے گزارا۔ اس نے ضد بھی نہیں کی۔ اور اپنی فیڈ وغیرہ بھی لیتی رہی۔ یہ واقعی حیران کن بات ہے۔"
"اچھا تو کیا آپ کو خالہ اماں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ سب ہنی کی ذات کا کمال تھا۔" ازکی نے ان کے چند ماہ کر بات کرنے پر تھوڑا سا چونک کر پوچھا۔
"او یس یس ابھی اماں نے مجھے سب بتا دیا تھا اور باقی جو رہ گیا تھا وہ آپ بہنوں کی زبانی معلوم ہو گیا تھا۔ اور اسی بات پر تو میں سخت متعجب ہوں۔ ورنہ بے بی پر گورنس بھی رکھیں اور آیائیں بھی مگر وہ کسی کے ساتھ بھی خود کو ایڈجسٹ نہیں کر سکی۔ ویسے بائی دا وے ہنی سے آپ کی فرینڈشپ ہے اور آپ کی کزن بھی ہیں۔ کیا انہوں نے کبھی اپنے مستقبل میرا مطلب شادی وغیرہ کے بارے میں بھی آپ سے بات کی ہے۔" مراد نے جھینپتے ہوئے آخری فقرے قدرے جھجک کر کہے۔
"نہیں، ایسے ٹاپک پر بات کرنے کی تو کبھی نوبت ہی نہیں آئی۔ ویسے بائی دا وے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کو یہ ہنی کی شادی کا خیال کیسے آیا؟" ازکی نے تجاہل سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔ تو مراد کچھ سٹپٹا سے گئے پھر ہوتے سے بولے۔
"تمہیں تو معلوم ہے ڈیئر سسٹر صائمہ کے انتقال کے بعد میں نے واقعی دوسری شادی نہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا کیونکہ مردوں پر ہمیشہ یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ بیوی کے مرنے کے بعد فوراً ہی اس کی محبت اور وفا کو دل سے نکال کر پھینک دیتے ہیں۔ اور دوسری عورت کی محبت کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا میں اس الزام کو غلط ثابت کر کے دکھانا چاہتا تھا۔ اور میرا تو کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ لیکن امی ابو کا اصرار ہے کہ میں بے بی کے سکون کی خاطر دوسری شادی کر لوں۔ وہ بھی ہنی سے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سلسلے میں کروں تو کیا کروں۔ دل تو نہیں چاہتا مگر زندگی کی گاڑی کو کسی نہ کسی طرح آگے کھینچنا تو ہو گا ہی۔ یوں بھی آپ نے دیکھ ہی لیا ہو گا کہ ہنی کے جانے کے بعد بے بی کی صحت کس تیزی سے گرتی جا رہی ہے۔ سو تو بی ویری ڈیئر سسٹر میں اس معاملے میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔ آپ میرا ساتھ دیں۔ اور میری مجبوریوں کے ساتھ میری درخواست ہنی تک پہنچا دیں۔ بلکہ اگر وہ خاموشی پر آمادہ ہوں تو آپ انہیں سمجھا بجھا کر کسی نہ کسی طرح راضی کر لیں۔ پلیز میری بہن۔" تو ازکی نے ان کے فقرے پر ہنس کر کہا۔
"شکر ہے آپ نے میری بہن تو کہا ورنہ سسٹر کہنا مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے آپ کسی ہسپتال کی ہیڈ نرس یا مڈوائف کو بلا رہے ہوں۔"
اور اس بات پر مراد رسمی سے انداز میں ہنس کر رہ گئے۔
"ویسے جب آپ نے مجھ سے مدد ہی مانگی ہے تو میں اپنی طرف سے انہیں راضی کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔ مگر ایک بات بتا دوں کہ آپ خود اپنا انٹرسٹ ظاہر نہ کیجیے گا۔ بلکہ میرے خیال میں تو ابھی اس کے سامنے ہی نہ پڑیے گا۔ کیونکہ ابھی تو میں صرف بے بی کی زندگی اور مستقبل کا معاملہ سامنے رکھ کر اس سے بات کروں گی۔ بس خدا کرے وہ مان جائے۔ گو امید تو بالکل نہیں۔ ویسے جب آپ نے مجھے اتنی بڑی ذمہ داری سونپی ہے تو ایک بات میں آپ سے بھی پوچھوں گی۔ پوری صداقت کے ساتھ بتائیں کہ کیا آپ بھی ہنی کی ذات میں اسی قدر انٹرسٹڈ ہیں؟"
ازکی نے بڑی جانچتی نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ اور جواب میں پہلے تو وہ تھوڑا سا سٹپٹائے تھوڑا سا گڑبڑائے۔ پھر مسکراتے ہوئے انداز میں بولے۔
"بہت ہی ٹیڑھا سوال کیا ہے آپ نے عظمت۔ اب میں جواب میں اتنا ہی کہوں گا کہ بچپن میں ہم فلورنس نائٹ انگیل اور شہزادی بدخشاں عالم جہاں کی کہانیاں پڑھتے تھے یا سنتے تھے تو ہمارے ذہنوں میں ایک بہت ہی پاکیزہ اور حسین سا خاکہ ہوتا تھا ان ہستیوں

کے کردار ہائے نمایاں کے لیے۔ بس یہی کچھ حال یا خیال میرا بھی ہے۔ ہنی کے بارے میں۔ ورنہ ہنی کے ماضی سے واقف ہوں نہ حال سے۔ نہ یہ جانتا ہوں کہ ان کا مزاج اور خیالات کیسے ہیں۔ اور نہ ان کے خاندانی بیک گراؤنڈ سے ہی واقف ہوں۔ حد تو یہ ہے کہ مجھے یہ تک نہیں معلوم کہ انہوں نے کہاں تک تعلیم پائی ہے۔ اور کس شہر میں اور کس جگہ رہتی رہی ہیں۔ یعنی ان باتوں کی طرف سے تو میں بالکل اندھیرے میں ہوں اور ان سب باتوں سے واقف ہونے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔ میرا ان سے تعلق صرف جینی کے حوالے سے ہے۔ اور جینی کا حوالہ بہت گہرا اور مربوط ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسی رابطے نے مجھے ہنی کی ذات میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا ہے۔"
"ہو ہو آپ بھی بڑے چالاک ہیں مراد بھائی کس خوبصورتی سے اپنی دلچسپی کو لفظی جامہ پہنایا ہے۔" ازکی نے ان کی باتوں پر ہنس کر کہا۔
"لیکن آپ اگر اس وقت یہ کہتے کہ آپ کو ہنی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بلکہ اپنی جینی کے مستقبل کی خاطر آپ اسے اپنانے پر مجبور ہو گئے ہیں تو قسم خدا کی میں اس معاملے میں آپ کی بالکل مدد نہیں کرتی۔ یوں بھی ایسی کوئی یقینی بات نہیں ہے کہ میں اس معاملے میں ہنی کو راضی ہی کر لوں گی۔ مگر میں اپنی پوری کوشش کروں گی۔"
ازکی نے کہا اور پھر وہاں سے اٹھ گئی۔ اور مراد بھی اسے کھڑا ہوتا دیکھ کر خود بھی کھڑے ہو گئے مگر جواب میں انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔
پھر دو تین روز بعد ہی جمعرات کی شام کو عظمت خود ہی کار ڈرائیو کر کے اس کے ہوسٹل جا پہنچی۔ اصل میں وہ مصلحتاً جمعرات کو گئی تھی تاکہ جمعہ کو اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے۔ کیونکہ اپنے گھر میں ہی وہ اطمینان سے ہنی سے گفتگو کر سکتی تھی۔
عظمت دستک دیے بغیر دروازہ کھول کر دبے پاؤں اس کے روم میں داخل ہوئی تو وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی نیل فائل سے اپنے ناخن گھستی نظر آئی۔ عظمت نے کھنکار کر کہا۔
"ہیلو ڈیئر کزن۔ سلامتی ہو تم پر۔"
"وعلیکم السلام۔ مگر یہ اردو میں ترجمہ کر کے کیوں کہہ رہی ہو، کیا سیدھے سبھاؤ السلام علیکم نہیں کہہ سکتی تھیں۔" ہنی نے اس کی اچانک آمد اور آواز پر بلا جھجک نیل فائل ایک طرف رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
"کیوں نہیں کہہ سکتی تھی، مگر اردو میں کہنے سے کوئی فرق تو نہیں پڑا۔ معنے تو ایک ہی ہوئے ناں۔" عظمت نے بیڈ پر اس کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے کہا۔
"ہاں معنی تو ایک ہی ہوتے ہیں۔ خیر تم سناؤ سب خیریت تو ہے ناں؟" ہنی نے اٹھ کر نیل فائل سرہانے رکھی۔ میز کی دراز میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں سب خیریت ہی ہے۔ بس تم سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔ اس لیے چلی آئی۔ تم نے مائنڈ تو نہیں کیا؟" ازکی نے کہا۔
"تمہاری دماغی صحت میں کچھ خلل تو نہیں واقع ہو گیا۔ جو اتنی اسٹوپڈ سی بات کہہ دی تم نے۔ جبکہ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میرا یہاں تم لوگوں کے سوا اور کوئی ہے بھی نہیں۔ مجھے تو اتنی خوشی ہو رہی ہے تمہیں اچانک دیکھ کر۔"
ہنی شگفتہ آمیز سے لہجے میں بولی اور ذرا ایک منٹ کہہ کر غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ دھوئے اور چند لمحے بعد واپس پلٹ کر ازکی کے پاس ہی آ بیٹھی جو اس کی شگفتہ آمیزی اشارے پر قدرے تذبذب میں پڑ گئی تھی۔ اپنی بات سنبھالنے کی غرض سے بولی۔
"بھئی تم تو بہت حساس ہو گئی ہو، ورنہ میں نے تو محض یونہی مذاق میں کہہ دیا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ یہ دس بارہ دن کیسے گزرے، تم یہاں کیسا محسوس کر رہی ہو۔ یعنی دل لگ گیا تمہارا یہاں؟"
"ہاں، دل تو اگر نہ بھی لگتا تب بھی لگانا ہی پڑتا۔ کہ یہاں رہنا میری ایک مجبوری ہے۔ ویسے اب تک میں نے جو اندازہ لگایا ہے تو اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ یہاں سب اپنے آپ ہی میں مگن رہتے ہیں یعنی دوسرے کے معاملات میں تاک جھانک نہیں کرتے۔ لیکن کھانا کچھ اچھا نہیں ہوتا یہاں کا۔ ویسے ابھی تک اس روم میں سنگل بیڈ ہی پڑا ہوا ہے۔ مگر دوسرے بیڈ کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اور اگر کوئی اور بھی اس روم کا حصے دار بن گیا تو پرائیویسی میں ضرور خلل پڑنے لگا۔" ہنی نے کہا اور پھر ایکدم ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا پہلے میں تمہارے لیے چائے وغیرہ منگوا لوں پھر اطمینان سے تم سے باتیں کروں گی۔" اور ازی نہیں نہیں ہی کرتی رہ گئی مگر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد ازی روم کا جائزہ لیتی رہی۔ ہوسٹل کا فرنیچر پردے بلکہ ہر چیز اوسط طبقے کی کر کے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ بار بار دھلنے کی وجہ سے پردوں کے رنگ بھی پھیکے پڑ گئے تھے۔ در و دیوار بھی اینٹ کھونے یعنی بدرنگ سے لگ رہے تھے۔ اور فرنیچر بھی کوئی خاص نہیں تھا۔ صرف ایک بیڈ ایک میز اور ایک کرسی۔ الماری چونکہ دیوار میں نصب تھی اس لیے وہی کام آ گئی تھی۔ اور اس معمولی سے کمرے کے ناشتے اور دونوں وقت کھانے سمیت ہنی کو تین ہزار روپے ماہانہ بھرنے پڑ رہے تھے۔ اور کراچی جیسے بڑے اور مہنگے شہر میں یہ بھی بہت غنیمت تھا اور ازی ان ساری چیزوں کو دیکھ کر دل میں سوچ رہی تھی کہ واقعی اب ہنی کو شادی کر ہی لینی چاہیے۔ تبھی ہنی چائے کا آرڈر دے کر واپس آ گئی۔

"بھئی یہ چائے وائے کا تکلف کیوں کیا تم نے، میں تو گھر سے پی کر ہی نکلی تھی۔" ازی نے کہا۔

"اچھا تو کولڈ ڈرنک منگوا دوں؟" ہنی نے پوچھا۔

"ارے نہیں۔ بس تم تو یہاں میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔ دیکھو ابھی ابھی جو تم مجھے ایک عدد یاسیت بھرا ڈوز پلا کر گئی تھیں۔ اس کے بارے میں مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" ازی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولی۔

"واٹ؟ کیسا یاسیت بھرا ڈوز؟" ازی کی بات ہنی کے پلے نہیں پڑی تو اس نے پوچھا۔

"بھئی یہی ساری تقریر جو تم یہاں کے ماحول اور کمرے وغیرہ کے بارے میں بڑی یاسیت کے ساتھ جھاڑ کر گئی تھیں۔ تو ڈیئر نہ تو تم اتنی مظلوم ہو نہ مجبور اور نہ کنگال۔ جو ایک ایسی ناپسندیدہ جگہ پر قیام کرنا تمہاری مجبوری بن گیا ہے۔ جبکہ تم اپنی مرضی اور خوشی سے یہاں سروس کر رہی ہو۔ اللہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمہیں اپنے پرسنل اور دولت کے معاملے میں پورے پورے اختیارات حاصل ہیں۔ تم اپنی زندگی کے تمام تر فیصلے اپنے طور پر کرنے پر قادر ہو۔ پھر یہ مجبوری کا اظہار؟ میرے خیال میں تنہا رہنے کے احساس نے تمہیں دل گرفتہ سا کر کے رکھ دیا ہے۔ اور میرے خیال میں تو تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اب تم شادی کر لو۔" ازی ایک لمبی تمہید کے بعد بالآخر اصل موضوع پر آ ہی گئی۔

"ہائیں واٹ؟ یعنی میں شادی کر لوں میں۔ کچھ معلوم ہے تم سے تین سال بڑی ہوں اور زندگی کے ستائیس سال کراس کر چکی ہوں۔" ہنی برا ماننے کے بجائے ازی کے مشورے پر یوں کھلکھلا کر بولی جیسے ازی نے بری طرح اسے گدگدایا ہو۔

"خیر خیر ستائیس سال پر کیا موقوف تم تو سنتالیس سال کی بھی ہو جاؤ تو اتنی اسمارٹ اور پیاری سی ہو کر ایک ستائیس سالہ نوجوان بھی خوشی خوشی تم سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اب بھی تم ذرا سا اشارہ تو کرو وہ تمہاری ایک جنبش ابرو پر ایک سے ایک پرکشش جوان نہ صرف اپنی آنکھیں فرش راہ کر دے گا بلکہ اپنے دل کا ریڈ کارپٹ تمہارے قدموں تلے بچھا دے گا۔" ازی نے بڑی روانی سے یہ آخری فقرے کہے خاص طور پر دل کا ریڈ کارپٹ کہنے پر ہنی کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

"ہا ہا ہا۔ بات کرنے پر آتی ہو تو پھر راہ میں کھائی آئے میدان آئے یا پہاڑ زبان کی رفتار سے اسے عبور ہی کرتی چلی جاتی ہو، ورنہ بھلا ایسا کون بے وقوف ہو گا جو میرے راستے میں اپنے دل کا ریڈ کارپٹ بچھائے گا۔"

"ہے کوئی ہے، جبھی تو کہہ بھی رہی ہوں۔" ازی بولی۔

"اچھا مگر کون۔ کون ہے وہ؟" ہنی نے پوچھا۔ اس کے انداز میں تعجب بھی تھا اور تجسس بھی۔

"وہ جو کوئی بھی ہے میں اس کے بارے میں تمہیں یہاں نہیں بلکہ جب تم میرے گھر آؤ گی تو پوری تفصیل کے ساتھ بتا دوں گی۔ تم ایسا کرو کہ کل صبح میرے یہاں آ جاؤ۔ بلکہ میں گاڑی دے کر شوفر کو یہاں بھیج دوں گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔" تو ہنی نے قدرے تامل کے بعد آہستہ سے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ مگر گیارہ بجے کے بعد ہی بھیجنا۔"

اور پھر اسے کچھ خیال آیا تو بولی۔

"مگر یہ نہ سمجھنا کہ میں کسی چارم میں تمہارے یہاں آ رہی ہوں۔ بلکہ تم آج اگر نہ بھی آتیں تو میں نے تو پہلے ہی سے کل جمعہ کو تمہارے یہاں آنے کا سوچ رکھا تھا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ جینی کیسی ہے؟"

"او ہو بڑی دیر میں جینی کا خیال آیا۔" ازی چبھتے لہجے میں بولی۔

"مگر آ تو گیا۔" اس نے قدرے چڑ کر کہا۔

"ہاں یہ بھی تمہاری عنایت ہے۔ ویسے بے چاری جینی کی صحت بہت گر گئی ہے۔ کھانا بھی بڑی منتوں کے بعد کھاتی ہے، وہ بھی بہت کم۔ دودھ پینا تو اس نے چھوڑ ہی دیا ہے۔ اور تمہارے جانے کے بعد سے اتنی چڑچڑی ہو گئی ہے کہ بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ تم کو بہت یاد کرتی ہے۔ تم خود آ کر دیکھ لینا نا اسے۔" ازی نے تفصیل بتائی۔

"اف توبہ! میں تو باز آئی اسے تھوڑی سی توجہ دے کر۔" ہنی نے چڑ کر منہ ہی منہ میں بڑی بیزاری سے کہا۔ جسے ازی نہ سن سکی اور اسے خدا حافظ کہہ کر گھر لوٹ آئی۔

گھر آ کر اس نے سوائے مراد کے کسی کو بھی گھر میں نہیں بتایا کہ وہ ہنی سے ملنے گئی تھی اور ہنی کل سارا دن گزارنے یہاں آنے والی ہے۔ مراد کو بھی اس نے صرف اتنا بتایا کہ وہ اس معاملے میں بالکل پر امید نہیں ہے۔ البتہ جو کام اس کی خالہ اور مراد نے اسے سونپا تھا، وہ اس کا فیتہ ضرور باندھ آئی ہے جسے کاٹنا یا نہ کاٹنا ہنی کی مرضی اور خوشی پر ہی منحصر ہو گا۔

بہرحال اگلے روز اس خیال سے کہ ہنی کہیں نہ آ سکنے کا کوئی عذر پیش کر دے عظمت خود جا کر اسے ساتھ لے آئی تھی۔

اس کے آتے ہی تو جینی اس کے گلے کا ہار بن گئی ——— اس سے ایسی چپکی کہ بڑی مشکلوں سے اس کا پیچھا چھوڑا۔ خود ہنی بھی اسے اتنا کمزور سا دیکھ کر اپنی ساری ہمدردیاں اور شفقت اس پر نچھاور کرتی رہی۔ ہنی نے بہلا پھسلا کر اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا اور فیڈ کے وقت فیڈر بھی پورا ختم کرا کر رہی۔ حتیٰ کہ آیا سے اسے نہلایا بھی اور کپڑے پہنوا کر اسے اس کے کاٹ میں ڈال کر اسے سلا بھی دیا۔ اس کے بعد ہی اسے گھر والوں سے بات کرنے کی فرصت ملی۔ ازی تو صبح سے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔

وہ اسے لونگ روم میں لے آئی اور کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے تھوڑی سی تمہید باندھنے کے بعد وہ عرض مدعا زبان پر لے آئی۔ مگر وہ تو شادی کا نام سن کر ہی چونک گئی۔

وہ بھی مراد سے ایکدم کھونٹے سے ہی اکھڑ گئی تھی اور عظمت کے لاکھ سمجھانے اور دلائل پیش کرنے کے باوجود کسی طرح راضی ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ مراد جو اس کمرے میں چھپے اس کی گفتگو سن رہے تھے۔ انہوں نے کسی نہ کسی طور پر اسے راضی کرنے کی غرض سے ہی خود کو ظاہر کرتے ہوئے یہ کہہ دیا۔

"اگر آپ کے لیے یہ ناممکن بھی ہے تو پلیز میک اٹ پوسیبل (اسے ممکن بنا دیں)"

اور ان کے اس فقرے نے تو جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ غصے میں نہ صرف اسی وقت ہوسٹل چلی آئی بلکہ اس نے آئندہ عظمت سے میل جول نہ رکھنے کا بھی تہیہ کر لیا۔ غصہ تو اسے سب سے زیادہ اس بات پر آ رہا تھا کہ مراد نے ایک دم چھچھورے مردوں کی طرح چھپ کر نہ صرف اس کی باتیں سنیں، بلکہ اس سے اس بات کو ممکن بنانے کو بھی کہا۔

ہو گئی ناں آخر وہی مردوں کی ہرجائی پن کی بات۔ بھلا آج تک کوئی مرد بھی وفا شعار ثابت ہوا ہے۔ وہ تو بیوی کی زندگی میں ہی اس سے بے وفائی کرتا ہے۔ اسے دھوکا دیتا ہے۔

اسے اس قدر بے وقعت کر کے رکھ دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگتی ہے۔

ہونہہ! بڑا دعویٰ تھا ازی کو کہ مراد بہت وفا شعار اور مضبوط کردار کے حامل ہیں۔

یہ ہیں، وہ ہیں، آج پتا چل گیا ناں کہ کتنے پانی میں ہیں۔ تو بھلا یہ مجھے اپنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں جیسے میں اتنی فالتو ہی ہوں، جو ایک شادی شدہ مرد سے شادی کرنے پر تیار ہو جاؤں گی۔

شاید نہیں، روپے پیسے پر بہت گھمنڈ ہے۔ اور
آخر وہ اپنی بیٹی کو بنانا چاہتے ہیں۔
ان کی بیٹی کو ذرا سا پیار کیا دیا کہ تو سر پر ہی
چڑھ دوڑے۔ اور یہ ان ہی کا سارا گھر تھا، اسی معاملے
میں ملوث تھا۔ تبھی تو سب میری خاطروں میں بچھ
بچھ جاتے تھے۔
کتنے چالاک لوگ ہیں سب کے سب اور کتنی
مطلبی دنیا ہے۔ اسے رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔
کیونکہ وہ جسے شادی کا لفظ کسی گالی سے کم
نہیں لگتا تھا، اُسے ہی شادی کرنے کی پیشکش کی
گئی تھی۔ اُسے مرد ذات سے نفرت تھی۔ ازلی نفرت
اور ایسے نفرت زدہ ہجوموں میں اس کے باپ کا
نام سرِ فہرست آتا تھا۔
وہ جو اتنے سارے اپنوں کے ہوتے ہوئے
اتنی بڑی دنیا میں بالکل تنہا تھی یعنی اس کے والدین،
بھائی بہن اور دوسرے قرابت دار بھی موجود تھے
مگر بہت عرصہ پہلے ہی اس نے ان سب کو اپنی
زندگی سے خارج کر دیا تھا۔
اس کے والد کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے
تھے اور ان کے یہاں تقریباً سب ہی تجارت پیشہ
تھے۔ ان کی والدہ کے اپنی خالہ کی بیٹی تھیں، بچپن ہی
میں بہت سے انہیں اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا
تھا اور یہ آپس میں خرچ کی داری — ہونی تھی اس
لیے دلوانے بھی اس مانگ پر کوئی اعتراض نہیں کیا
تھا۔ کچھ کس کے دن تھے۔ اسی لیے والد نے بھی کچھ
طرح اس رشتے کو قبول کر لیا تھا۔ دیگر انہوں نے
بچپن کی لاابالی فطرت کی وجہ سے کچھ خیال نہیں کیا تھا۔
مگر شادی کے بعد اس کے والد، اس کی والدہ
میں خامیاں نکالنے لگے۔ اچھی بھلی شکل وصورت
کی پڑھی لکھی خاتون تھیں، مگر ابا کو ایک آنکھ نہ بھاتی
تھیں۔ اس کی اصل وجہ تو ان کے کاروبار میں شراکت
دار مقبول حسین کی جوان سال بہن تھی۔ جو بہت حسین
تو تھی، مگر اسے بہلانا اور ادائیں دکھانا خوب آتا
تھا اور اس کے والد جب اس سے شادی کرنے
کے لیے بہت بے چارے تھے، مگر چونکہ ان کے والدین
حیات تھے، اس لیے اتنا بڑا قدم اٹھانے کی جرأت

نہیں پڑی تھی۔
ماں کے یہاں پہلوٹی کا بیٹا ارشد پیدا ہوا تھا، اس
کے بعد سجل پیدا ہوئی اور آخر میں وہ خود — اور
اس خود کو تو کچھ ہوش ہی نہ تھا کہ اس کی پیدائش کے
بعد کیا حالات پیش آئے اور کیا کیا قیامتیں ٹوٹیں، یہ
کہ اس کی ماں سے اس کے تینوں جگر گوشوں کو چھین
کر اسے گھر سے باہر نکال دیا گیا اور بعد ازاں طلاق
بھی دے دی گئی۔ اسے تو بس محرومیت کا کچھ ایسا
شدید احساس تھا کہ اس کا ذہن سویا سویا سا رہنے
لگا تھا۔ بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے سنِ بلوغت
میں قدم رکھنے تک وہ ایسی گم صم اور کھوئی کھوئی سی
رہتی تھی کہ گھر میں سب ڈھیلی کہہ کر پکارتے
تھے۔ ماں سے بچھڑنے کی اذیت اتنی گہری اور اتنی
شدید تھی کہ وہ نامعلوم کیسے اسے برداشت کر رہی تھی۔
اور سب سے بڑھ کر یہ تکلیف دہ حقیقت کہ
ماں نے طلاق ملنے کے کچھ ہی عرصے بعد دوسری
شادی کر لی تھی۔ جبکہ باپ نے تو ماں کے گھر
سے نکال دینے کے ایک ہی ہفتے بعد اپنی پسند
کی عورت سے شادی کر لی تھی۔ مگر دوسری شادی
کرنے کے جرم میں اس کے والد نے اس کی ماں
کو بچوں سے میل جول رکھنے کی بھی اجازت نہیں
دی تھی۔
ہنی کو ان ساری باتوں کی اصل خبر نہ تھی۔ وہ
تو بچپن سے ہی سوتیلی ماں اور ددھیالی عزیزوں کی
زبانی یہی سنتی آئی تھی کہ اس کی ماں بہت سنگ دل
تھی۔ جسے بچوں سے بچھڑنے کا ذرا سا بھی دکھ نہیں
ہوا اور اس نے عدت ختم ہوتے ہی دوسری شادی
کر لی تھی۔
سوتیلی ماں تو اس کی ماں کے بارے میں ہمیشہ
زہر ہی اگلتی رہتی تھی کہ وہ انتہائی پھوہڑ، بدمزاج
اور بدکردار عورت تھی۔ اس شخص سے جس سے اس
نے عقدِ ثانی کیا تھا، اس کے شادی سے پہلے ہی
ناجائز تعلقات تھے۔ شکل وصورت کی بھی اچھی نہیں
تھی۔ سانولی رنگت کی تھی اس پر بے حد جاہل۔ اسی لیے تنگ
آکر اس کے والد نے اسے طلاق دے دی تھی۔
گو کہ یہ جھوٹ بھی نہیں، سفید جھوٹ تھا اور اس کے

ددھیالی عزیز داروں — کو سب کچھ معلوم تھا، مگر
وہ سب بے حد دنیادار اور مادہ پرست تھے۔ وہ اس
کے والد اور سوتیلی ماں کے سامنے زبان نہیں کھولتے
تھے اور ادھر سوتیلی ماں تھی کہ بات بات پر ان تینوں
بچوں کو اس کی ماں کا طعنہ دیتی تھی۔
ماں کے سارے کرتوتوں کا خمیازہ ان تینوں بھائی
بہنوں کو بھگتنا پڑتا تھا۔ بھائی اس سے سات برس بڑا
تھا۔ پہلوٹی کا تھا اس لیے سوتیلی ماں کے کنٹرول
میں مشکل سے ہی آتا تھا۔
والد نے تنگ آکر اسے بورڈنگ میں داخل
کرا دیا تھا۔ سجل بے چاری چونکہ سات سال کی
تھی اور منجھلی اولاد تھی، اس لیے ظلم تو اصل میں اس
پر ٹوٹا گیا تھا۔ اتنی چھوٹی سی عمر سے سوتیلی ماں اس
سے اپنے سارے کام کراتی تھی اور ذرا سی غلطی پر
اسے ڈھنک کر رکھ دیتی تھی۔ جب کہ ہنی پر کم تشدد
کیا جاتا تھا، مگر کچھ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے
اور کچھ اس لیے کہ دوسری بیوی سے اولاد ہونے
کے عرصے تک وہ باپ کی توجہ کا مرکز رہی تھی۔ اسے
کم ہی سوتیلی ماں کے ظلم کا نشانہ بننا پڑتا تھا، مگر جب
سوتیلی ماں کے یہاں تلے اوپر دو تین بچے پیدا
ہو گئے تو ہنی کی قدر بھی کھوٹی ہو گئی۔
باپ نے چوتھے برس ہی اسے اسکول میں داخل
کروا دیا تھا۔ سوتیلی ماں سے نپٹے ہونے کے بعد
بھی وہ پڑھتی ہی رہی۔ اصل میں تو اس کے والد تعلیم
کے بڑے حامی تھے یا پھر اس کی قسمت میں تعلیم حاصل
کرنا رقم کر دیا گیا تھا۔ اس لیے وہ بڑے شوق اور
لگن سے کہ اس طرح گھر کے ذہنی ماحول سے بھی
چھٹکارا حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ پڑھتی گئی۔
بیٹیوں کی شادی کے بارے میں جب باپ کو
پروا نہ تھی تو سوتیلی ماں کو کیا ہوتی اور سجل کو تو اس
نے زرخرید بنا کر رکھا ہوا تھا، گو اسکول کے بعد کالج
اور کالج کے بعد یونیورسٹی سے آکر بیشتر کام تو اسے
بھی کرنے پڑتے تھے۔ بالخصوص شام کی روٹی پکانا
اس کے ذمے تھا، جو اسے بہت ہی ناپسند تھا۔ ابا
چاہتے تو ایک چھوڑ، دو دو ملازم رکھ سکتے تھے، مگر
جب انہیں مفت میں دو دو ملازمائیں مل گئی تھیں تو

انہیں ضرورت ہی کیا تھی کوئی ملازم یا ملازمہ رکھنے کی
ماسوائے ان بڑے میاں کے جو چوکیداری کا فریضہ
بھی انجام دیتے تھے اور گھر کا سودا سلف بھی لا
دیا کرتے تھے۔
اب یہ بھی نہیں کہ اس کی ددھیال میں کوئی تھا
ہی نہیں — چچا، پھوپھیاں، چچا زاد اور پھوپھی زاد
بھی موجود تھے، مگر سب ہی سوتیلی ماں کے ہی گن گاتے
نظر آتے تھے۔ کسی چچا یا پھوپھی نے پیار کے دو
بول کہنے تو کجا کبھی ان کے سروں پر پیار سے ہاتھ
بھی نہیں رکھا تھا، بلکہ ان کے کاموں میں طرح طرح
کے عیب ہی نکال کر جاتے تھے۔ اس کے سگے دو
ماموں بھی تھے اور خالائیں بھی — مگر ان میں سے
کبھی کسی نے پلٹ کر ان تینوں بھائی بہنوں کی خبر
نہیں لی تھی۔
بڑے ماموں البتہ ایک مرتبہ وہ بھی محض اتفاقی
جیسے آندھی اور طوفان میں تیز ہواؤں کی زد میں
آکر کوئی جھونکا سا بھٹکا — آکر نہیں آجاتا ہے، اس
سے ملنے آگئے تھے، مگر وہ بھی سوتیلی ماں کی متکبرانہ
خوش اخلاقی اور چاپلوسی سے اتنے متاثر ہوئے تھے
کہ انہوں نے ڈھنگ سے بھانجیوں کا حال احوال
تک نہ پوچھا تھا، جبکہ وہ چاہ رہی تھی کہ موقع ملے تو
ان سے اپنی ماں کے بارے میں پوچھے، مگر اس کے
دل میں یہ خواہش حسرت ہی بن کر رہ گئی۔ ماموں سوتیلی
ماں کی کھوکھلی مسکراہٹوں میں لپٹے، پھر کبھی آنے
کا کہہ کر واپس چلے گئے۔
والدین کے ہوتے ہوئے بھی چونکہ دونوں
بہنیں لاوارثوں کی طرح اس گھر میں پل بڑھ رہی
تھیں۔ اس لیے چچا زادوں اور پھوپھی زادوں کی
جرأتیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ وہ ان دونوں سے بے ہودہ
مذاق کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔
سجل بے چاری تو جیسے بغیر زبان اور بغیر احساسات
کے ہی پیدا ہوئی تھی۔ انتہائی ڈرپوک اور بے زبان
سی تھی، مگر ہنی نے ایک دن ایک ایسے ہی بے ہودہ
سے مذاق پر اپنے ایک چچا زاد کی پٹائی کر دی تھی۔
نہ صرف یہ کہ بلکہ جب سوتیلی ماں اور اس چچا زاد اور
پھپھی نے نمک مرچ لگا کر اس کے ابا سے اس کی

شکایت کی تھی تو ان کے ہاتھ اٹھانے کی پروا نہ کرتے ہوئے تبنی نے چیخ چیخ کر باپ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ آپ کو تو ہماری پروا نہیں، مگر ہم اس گھر کی عزت ہیں اور ہم اپنی عزتوں کی حفاظت اسی طرح کریں گے، خواہ آپ مار مار کر ہمیں ختم ہی کیوں نہ کر دیں۔"

اس کی اس دیدہ دلیری پر باپ کا ایک زناٹے دار تھپڑ تو پڑا تھا مگر باپ نے سب کے سامنے سوتیلی ماں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "آئندہ اگر ایسی کوئی شکایت کی گئی تو میں الٹا ان لڑکوں کو مار مار کر ادھ موا کر دوں گا۔"

بہرحال، باپ کی یہ دھمکی اپنا کام کر گئی تھی اور اس دن کے بعد سے کسی کزن نے ان دونوں کو نہیں چھیڑا تھا، مگر وہ خون ہوتے دل کے ساتھ یہ ضرور سوچتی کہ کیا ایک ماں کے چلے جانے سے اس کی اولاد اتنی بے قدر اور بے وقعت ہو جاتی ہے، جیسے کہ ہم دونوں بہنیں ہیں، کیونکہ بھائی تو میٹرک کے بعد بورڈنگ سے بعد ازاں براہِ راست اپنی ماں کے پاس چلا گیا تھا اور پھر اس نے کبھی پلٹ کر خبر تک نہ لی تھی۔

اس لیے اس جلتے سلگتے ماحول میں پبلک ریلیشنز میں ایم۔ اے کیا۔ اور بھی پتا نہیں کیا کیا کرنا چاہتی تھی، مگر حالات نے مہلت ہی نہیں دی۔ اصل میں ایک کثیر الاشاعت اخبار میں ایک لیکچرر کی ضرورت کے اشتہار پر نظر پڑی۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر وہاں درخواست گزار دی۔ قسمت اچھی تھی، ایک ہی ہفتے بعد انٹرویو کے لیے کراچی سے اس کا بلاوا آ گیا۔ اس نے ساری تیاری تو پہلے سے ہی کر رکھی تھی۔ وہ باپ کے نام ایک خط چھوڑ کر فوراً ہی کراچی آ گئی، جہاں دوسرے روز ہی اسے منتخب کر لیا گیا۔

کراچی میں اس کی ایک دیرینہ دوست بھی اقامت پذیر تھی، جس کے یہاں اس نے صرف تین روز قیام کیا تھا کہ خوش قسمتی سے اسے ہوسٹل ہی میں فوراً کمرا مل گیا تھا اور چونکہ آتے ہی وہ اپنی آمد سے عظمت کو مطلع کر چکی تھی، اس لیے اگلے روز عظمت اپنی امی کے ساتھ ملنے کے لیے اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔

عظمت کے یہاں چند دن گزار کر چچا، چچی اور چچا زادوں کی یگانگت، محبت اور اپنائیت آمیز بھگت دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ رشتے داروں میں بھی کچھ لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں، جیسے زینب پھوپھو تھیں جو اس کی سگی اور سب سے چھوٹی پھوپھو، جن کا ذہن اپنی عمر سے چند سال پیچھے تھا، اس لیے ان کی شادی نہیں ہو سکی تھی۔ یہ بھی اسے جھوٹی اور بے بنیاد بات ہی لگتی تھی۔ سوتیلی ماں نے جان بوجھ کر ان کی شادی میں روڑا اٹکایا تھا، تاکہ جائیداد میں ان کے حصے کے بٹوارے اور جہیز میں لین دین سے بچ جائیں، ورنہ چھوٹی پھوپھو دماغی طور پر تو بالکل صحت مند ہی نظر آتی تھیں۔ اور ان دونوں بہنوں پر تو جان چھڑکتی تھیں، مگر ان کی کچھ چلتی ہی نہیں تھی۔ سوتیلی ماں تو ہر بات میں بھانجی مار دینے کی عادی تھی۔

بہرکیف، ازی اور اس کے گھر والوں کے ساتھ چند دن گزار کر بڑی مسرور سی تھی۔

جینی کی ذات میں اس کی دلچسپی کی وجہ کچھ یہ بھی تھی کہ ایک تو جینی بہت خوبصورت بچی تھی، دوسرے اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کو سنبھال سنبھال کر اسے بچوں کو بہلانے کا طریقہ اور سلیقہ آ گیا تھا۔ اور سوتیلی ماں کی بدسلوکی کی وجہ سے سوتیلے بہن بھائیوں پر تو وہ اتنی زیادہ توجہ اور یگانگت نچھاور نہ کر سکی تھی، جتنی بے ماں کی معصوم جینی پر اس نے کی تھی، مگر اس کا مطلب وہ تو نہیں تھا، جو عظمت اور مراد وغیرہ نے سمجھا تھا۔ اسے سب سے زیادہ رنج اور غصہ اس بات پر تھا کہ ان سب کی محبت بناوٹی تھی۔

اس میں برابر کا کھوٹ تھا، کیونکہ اس میں ان کی غرض شامل تھی۔

اسی لیے وہ اس کی خاطروں میں بچھے جا رہے تھے اور یہ وہی مراد تھا، جس کے بارے میں ازی نے بڑے دعوے سے کہا تھا۔

"وہ صائمہ باجی سے کبھی بے وفائی کر ہی نہیں سکتے اور نہ ان کے علاوہ کسی دوسری عورت کا تصور ہی کر سکتے ہیں۔"

ہونہہ اب دیکھ لی ناں ان کی اوقات بھی۔ یقیناً ازی نے انہیں اس معاملے سے علیحدہ رکھنا چاہا ہو گا

کہ میرا امپریشن ان کی طرف سے خراب نہ ہو جائے، مگر اپنی بے صبری اور ہوس میں خود ہی اپنے منہ سے بکنے پر مجبور ہو گئے۔

اُف توبہ! کیا دنیا کے سارے مرد فریبی، جفاکار اور خود غرض ہوتے ہیں۔ لو بھلا جان نہ پہچان اور چلے ہیں مجھ سے رشتہ جوڑنے، وہ بھی محض بیٹی کی خاطر، جیسے میں اتنی ہی فضول تو ہوں۔ وہ یہی سوچ سوچ کر چند روز تو اپنا خون جلاتی رہی، پھر اپنی تدریسی مصروفیات میں لگی تو جیسے سب کچھ بھول ہی گئی۔

ازی بھی پھر اس سے ملنے نہیں آئی، مگر فون ضرور کرتی رہی، جس کو اس نے ریسیو ہی نہیں کیا اور یوں تقریباً پچیس چھبیس دن سکون سے گزر گئے۔

اور وہ تقریباً بھول ہی گئی کہ اس کے احساسات کو کچوکے دینے والی کوئی بات بھی ہوئی تھی کہ ایک روز ازی خود ہی اس سے ملنے آ گئی۔

وہ بھی کالج میں، جب وہ پیریڈ ختم ہونے کے بعد اسٹاف روم کا رخ کر رہی تھی، گو عظمت بڑی پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، پھر بھی اسے اچانک وہ بھی تدریسی اوقات کے درمیان اپنے کالج میں کھڑا دیکھ کر اس کی پیشانی پر شکنیں سی پڑ گئیں۔

اپنی زبان سے اس کی آمد کی غرض و غایت معلوم کرنا بھی طبیعت کو گوارا نہ ہوا۔ بس بڑی خشونت بھری مستفسرانہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا، تو وہ فوراً ہی شروع ہو گئی۔

"سنو تبنی! جینی کی طبیعت بہت خراب ہے، بڑی نازک صورتِ حال ہے اس کی، ہم نے اسے اسپتال میں ایڈمٹ کرا دیا ہے۔" ازی واقعی بڑی سراسیمہ سی نظر آ رہی تھی۔

"اچھا تو گویا وہ ہڑکا کر رہی ہے میرا، اسی لیے اسے ان ٹینسو کیئر میں رکھ کر آ رہی ہو تم؟" اس نے بڑے زہریلے لہجے میں کہا۔

"نہیں، خدا نہ کرے ان ٹینسو کیئر میں تو نہیں ہے، وہ البتہ سرسامی کیفیت میں ضرور ہے۔ وہ بے چاری معصوم بچی۔ اس پر ستم یہ کہ مراد بھائی بھی آج کل یو۔ کے میں ہیں۔" عظمت نے اس کے کچھ بھی پوچھے بغیر مزید بتایا۔

"تو پھر اطلاع کر دی ہوتی انہیں جینی کی بیماری کی۔" وہ جلے کٹے انداز میں بولی۔

"اطلاع تو فوراً دے دی مگر قسمت سے وہ آج کل یو۔ کے سے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" وہ روکھے سے انداز میں بولی۔

"کم از کم چل کر اسے دیکھ تو لو، ممکن ہے تمہاری آواز سن کر اسے ہوش آ جائے۔"

"کیوں میری آواز میں کون سا ایسا جادو ہے جو اسے ہوش و خرد کی دنیا میں کھینچ لائے گا۔" وہ کھا جانے والے انداز میں بولی۔

"نہیں خیر جادو وادو تو نہیں، مگر وہ تم سے بے حد مانوس ہے ناں اور اگر تم برا نہ مانو تو میں یہی کہوں گی کہ واقعی اس نے تمہارا اثر لیا ہے۔" ازی نے ڈرتے ڈرتے اصل بات بتائی تو وہ کھول ہی اٹھی۔

"اُف ڈیم اٹ! پھر وہی بکواس، وہ مجھ سے کب مانوس ہے اور کیسے میرا اثر لے سکتی ہے، جبکہ اس سے میری چند روزہ واقفیت ہی رہی ہے۔"

اس نے غصے اور کوفت کے عالم میں ساری رواداری اور مروت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے تم تو کہا کرتی تھیں کہ انسانی برادری کے مربوط سلسلے کی پہلی کڑی مروت اور رواداری ہوتی ہے۔ اس کے بعد اخلاق۔"

"وہ سب بچپن اور نادانی کی باتیں تھیں اور میں نے اس لیے تو نہیں کہی تھیں۔ اچھا اب دوسرا پیریڈ شروع ہونے والا ہے، تم جاؤ یہاں سے۔" اس نے بھی مروت اور رواداری کو لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں جا رہی ہوں، مگر یہ بات یاد رکھنا کہ اگر جینی کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو اس کا معصوم خون تمہاری گردن پر ہو گا، کیونکہ تمہاری ہی وجہ سے اس کی حالت اتنی نازک ہو گئی ہے۔ شازی

بھی پہلی مرتبہ اس سے تلخ کلامی پر مجبور ہوگئی — اور فوراً ہی اس کے پاس سے چلی آئی۔

اور وہ اسٹاف روم کا رُخ کرنے کے بجائے کچھ دیر تک تو اسی جگہ کھڑی اس بات پر پیچ وتاب کھاتی رہی کہ آخران لوگوں نے اسے سمجھ کیا رکھا ہے۔ کیا لاوارثوں کی طرح اکیلا دیکھ کر یہ لوگ اس کی بے بسی اور بے کسی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، جو نت نئے عذر کر اور بہانے تلاش کرکے اس کے پاس آجاتے ہیں۔ یہ عظمت جو اسے کبھی بہت عزیز تھی اور سچ پوچھا جائے تو اتنے سارے کزنز میں صرف یہی ایک ہمدرد، خیر خواہ اور پیاری دوست تھی، اسے اب زہر لگنے لگی تھی۔ اس کا اعتماد اب دوستی جیسے عظیم رشتے سے بھی اٹھ گیا تھا۔

وہ یہی سب سوچتی اسٹاف روم کا رُخ کرنے ہی لگی تھی کہ دفعتاً اگلا پیریڈ شروع ہونے کی گھنٹی بج اٹھی، اور وہ الٹے قدموں کلاس روم کی طرف ہی بڑھ گئی۔

تین پیریڈ باقی رہ گئے تھے، جو اسے پہلی بار حد درجے طویل لگے۔ حالانکہ وقت اتنا ہی تھا، ان تینوں پیریڈز کا جتنا کہ روز ہوتا تھا، مگر وہ عظمت کے یہ آخری فقرے کہ اگر جینی کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو اس معصوم بچی کا خون تمہاری گردن پر ہوگا، کیونکہ تمہاری وجہ سے ہی اس کی حالت اتنی نازک ہوگئی ہے کسی بازگشت کی طرح اس کی سماعت سے بار بار ٹکراتے رہے تھے، رہ رہ کر اسے بے چین سا کیے دے رہے تھے۔

"کیا واقعی جینی کی حالت اتنی سیریس ہے، مگر کس وجہ سے ہے، یہ تو میں معلوم ہی نہ کرسکی، مگر یہ ماننے پر بھی تیار نہیں ہوں کہ میری وجہ سے ہے، یہ لوگ خوامخواہ ہی اس معاملے میں مجھے پھنسانے کی کوشش میں سیدا پھر چلا رہے ہیں۔ ورنہ یہی بات ہے ورنہ بھلا ازی کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی، وہ بیں فون پر جینی کی بیماری کی اطلاع دے دیتی تو کیا فرق پڑجاتا۔ خیر اب منکی کھا گئی ہے نا، یہاں سے آئندہ مجھے پھنسنے کی تو شامنے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ سے غصے سے زیادہ اس بات پر رنج و

ملال تھا کہ کوئی ایک رشتے دار بھی قابلِ بھروسا اور مخلص نہیں ہے۔ اسے ازی کی دوستی اور محبت پر کتنا مان، کتنا ناز تھا، مگر وہ بھی دغا دے گئی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آئی تو لاکھ ان خیالات کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کے باوجود بس یہی خیالات اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے، مگر پھر اگلے دن وہ سو کر اٹھی تو اسے یاد بھی نہ رہا کہ گزشتہ روز وہ ایک غیر محسوس سی بے کلی کے ساتھ سارا وقت کچھ سوچتی رہی تھی۔ یوں بھی اگلے دو تین روز وہ ٹیسٹوں کی وجہ سے بہت مصروف رہی تھی۔ شاید اس لیے بھی ازی وغیرہ کے بارے میں کچھ سوچنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔

وہ کوئی پانچواں یا چھٹا روز تھا۔ جمعرات کا دن تھا۔ اس روز چونکہ اسے چند پیریڈ ہی لینے تھے، اس لیے اطمینان سے تیار ہو کر کالج جانے کی غرض سے اپنا پرس ہاتھ میں لیے باہر نکلی ہی تھی کہ سامنے نصیرہ بیگم اور مراد کو آتا دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کیونکہ ان دونوں کی ایک ساتھ آمد ایک تو انتہائی غیر یقینی اور غیر متوقع تھی دوسرے نصیرہ بیگم کے چہرے سے تو کچھ ایسا حزن و ملال ٹپک رہا تھا کہ جسے دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کا نازک سا دل مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو— وہ ٹھٹھک جانے کے سے انداز میں انہیں سلام کرنے کے سوا ان کی اچانک آمد پر کچھ پوچھنے کی بھی ہمت نہ کرسکی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں استفسار سے زیادہ تجسس کارفرما تھا۔

نصیرہ بیگم نے خود ہی قدم آگے بڑھا کر اسے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔

"جیو — سدا خوش رہو— تم مجھے دیکھ کر حیران تو ہو رہی ہوگی، کہ یہ نصیرہ بیگم اچانک غیبی گولے کی طرح اچانک کہاں سے آ ٹپکیں، مگر میری تو اس وقت وہی مثال ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا۔ تم نے عظمت کو تو دھتکار دیا تھا اس دن، مگر مجھ سے اس معصوم بے ماں کی بچی کی حالت دیکھی نہیں گئی، اس لیے جھولی پھیلا کر تمہارے پاس آگئی ہوں۔"

اُف! تو یہ لوگ کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑیں

گے۔" اس نے دل میں سوچا اور پھر ان پر یہ جتلانے کو کہ وقت نکلا جارہا ہے اور وہ جلدی میں ہے، اس نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا، اور بیگانے سے انداز میں بولی۔

"جینی کو آخر شکایت کیا ہے خالہ اماں؟"

"اسے ایک شکایت ہو تو بتاؤں بھی بچی! پہلے تو وہ اللہ مارا ملیریا ہو گیا تھا، ایسا بلبلا کر تپ چڑھا تھا کہ تھرمامیٹر کا پارہ باہر نکلتا دکھائی دیتا تھا اور ایک سو سات ڈگری بخار۔ پھر اس سے کسی طرح بے چاری بچی کی جان چھوٹی، تو نمونیہ ہو گیا۔ اب یہ عالم ہے کہ نہ سر سے کھیلتی ہے نہ منہ سے بولتی ہے، کمزور بھی بہت ہو گئی ہے۔ اور ہو گی کیوں نہیں، ایک کھیل تک تو آج کر نہیں گئی منہ میں ایک مہینے سے۔ تمام وقت تو اس پر غشی سی طاری رہتی ہے، اور جب آنکھیں بھی کھولتی ہے تو ادھر اُدھر دیکھ کر تم کو ہی پوچھتی ہے۔ حالانکہ یہ مراد میاں اطلاع پاتے ہی خود آدوڑے دوڑے چلے آئے تھے۔"

اُف! انہوں نے تو یہ کہہ کر گویا کانٹا سا مار دیا تھا اس کے دل پر، مگر اس سے آگے سنا ہی نہیں کہ انہوں نے کیا کہا۔

جی تو چاہا کہ چیخ چیخ کر کہے کہ نہیں یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ لوگ خوامخواہ بچی کی بیماری کا ڈھونگ رچا کر مجھے اپنے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں، مگر نصیرہ بیگم کی غمزدہ آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہتے دیکھ کر وہ کوئی غیر روادارانہ جواب دیتے دیتے رُک گئی۔

"بیٹی! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، خدارا ایک مرتبہ ہی بچی کو اپنی صورت دکھا دو۔ ہم نے اسے اسپتال میں داخل کرا رکھا ہے، اگر تم ہمارے ساتھ جانا نہیں چاہتیں تو خود ہو آؤ، مراد میاں! اسپتال کا پتا صحیح تحریر کر کے انہیں دے دو۔" انہوں نے آخری فقرہ مراد کو مخاطب کر کے کہا۔

"جی بہتر" مراد نے جیب سے پتا نکالتے ہوئے کہا، جو وہ پہلے سے لکھ کر لائے تھے اور پھر اس کی طرف بڑھا دیا۔

اور اس نے مراد کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے

کی بھی زحمت گوارا نہیں کی اور بڑی بے رُخی سے وہ چھوٹی سی چٹ ان کے ہاتھ سے لے لی۔

نصیرہ بیگم اور مراد ابھی تک باہر ہی کھڑے تھے اور وہ بھی کالج جانے کے لیے پر تولے کھڑی تھی۔

نصیرہ بیگم اس کی بے رُخی کو محسوس کرنے کے باوجود اس کی خوشامد کیے جارہی تھیں۔ وہ جو عمر میں اس سے بہت بڑی تھیں، بزرگوں میں شمار ہوتی تھیں اور بڑی خوددار اور نکیلی سی تھیں، وہ یہ سب کیوں کر رہی تھیں۔ صرف اور صرف اپنی مرحومہ بیٹی کی اولاد کو بچانے کی خاطر ہی ناں — ایک لمحے کو اسے خیال سا گزرا تھا۔

"اچھا بیٹی! اب میں چلتی ہوں، تم تو اس وقت کالج جارہی ہو ناں، مگر سہ پہر کو تمہارے پاس وقت ہوگا، ہوسکے تو آج ہی اسے دیکھ آنا، باقی تمہاری مرضی۔"

نصیرہ بیگم نے اتنا کہا اور پھر فوراً ہی اپنے آنسو پونچھتی ہوئی مراد کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھ گئیں جہاں عظمت کی کار کھڑی تھی۔

وہ گم صم سی اپنی جگہ پر کھڑی انہیں جاتے دیکھ رہی تھی کہ دفعتاً اس کے دل میں بہت سارا رحم اُمڈ آیا۔

"ٹھہریئے خالہ اماں! ذرا ایک منٹ" نہایت غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکلا اور پھر تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے میں آئی۔

میز کی مقفل دراز کھول کر کاغذ نکالا اور پھر پین سے اس پر کچھ لکھ کر اسی سرعت سے باہر آ گئی۔

باہر کار کے قریب ہی نصیرہ بیگم، مراد کے ساتھ اس کے اندر سے وارد ہونے کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ اس نے باہر گیٹ پر بیٹھے چوکیدار کو وہ لفافے میں ملفوف رقعہ تھماتے ہوئے ہدایت کی کہ وہ اسے ابھی ابھی پرنسپل کو دے آئے اور پھر ایک ادھوری سی مسکراہٹ کے ساتھ نصیرہ بیگم سے مخاطب ہو کر بولی۔

"چلیے خالہ اماں! میں ابھی آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔"

اور نعیرہ بیگم نے مراد کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں آؤ — آؤ بیٹی چشم ما روشن دل ما شاد۔ اس سے بڑھ کر ہمارے لیے اور کیا تسکین کی بات ہوگی۔"

اس نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ان کے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

کار عظمت کا شوفر ڈرائیو کر رہا تھا۔ مراد بھی خاموشی سے اگلی سیٹ پر جا بیٹھے۔

"اسپتال کے اوقات تو پانچ سے آٹھ تک ہوتے ہیں اور ابھی تو ساڑھے دس ہی بجے ہیں۔ ایسا کرو کہ پہلے گھر چلی چلو پھر وہاں سے —"

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد نعیرہ بیگم نے اس سے کہا۔

گھر جانے کا سن کر تو وہ ایک دم تنک ہی اٹھی۔

اور ان کی بات کاٹ کر بولی۔

"کیوں کیا بچی کے پاس اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں ہے؟"

"جینی بے کیوں نہیں۔ اس کی آیا ہے، نرس ہے اور میں خود بھی وہاں تھا۔ بلکہ آج کل تو رہتا بھی وہیں ہوں۔" نعیرہ بیگم کے بجائے مراد نے جواب میں کہا۔

"اوہ کتنی بڑی غلطی ہوگئی، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ملاقات پانچ بجے سے پہلے ممکن نہیں تو بلاوجہ اپنی کلاسز نہ چھوڑتی۔" اس نے پشیمانی سے دل ہی دل میں سوچا۔

"لیکن آپ پر تو ایسی کوئی پابندی نہیں ہوگی، آخر میں بھی تو ابھی وہیں جاؤں گا۔ آپ میرے ساتھ چلی چلیں، اس طرح آپ کا ٹائم بھی ویسٹ نہیں ہوگا۔"

اس نے محسوس کیا کہ مراد اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں۔ گو ان کی پیش کش کچھ غلط نہ تھی لیکن ان کے ساتھ تنہا جانا تو وہ کبھی گوارا ہی نہ کرتی۔ اس نے نعیرہ بیگم سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اب وقت سے پہلے آ ہی گئی ہوں تو آپ کے ساتھ گھر ہی چلتی ہوں۔"

"ہاں ہاں، یہ تو اور بھی اچھی بات ہوگی۔ بچیاں بھی تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔"

نعیرہ بیگم نے خوش ہو کر کہا۔

اور یوں وہ ایک بار پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مگر بہت اتفاقیہ عظمت کے گھر پہنچ گئی۔

ساری بہنوں یا کزنز نے اسے پیار سے ہر طرف سے گھیر لیا اور صغیرہ بیگم کی خوشی کا تو ٹھکانا ہی نہ رہا۔ وہ تو اسے بڑی دیر تک لپٹائے کھڑی رہیں، البتہ نگہت ذرا کھنچی کھنچی سی رہی۔ وہ بھی سمجھ گئی کہ نگہت اس سے ناراض ہوگئی ہے۔

بہر حال کچھ ہی دیر بعد کھانے کا وقت ہو گیا اور کھانے کے بعد ادھر ادھر کی باتوں میں پانچ یوں بجے کہ وقت گزر جانے کا احساس تک نہ ہوا۔

ٹھیک پانچ بجے وہ نعیرہ بیگم اور وجیہہ کے ساتھ عظمت کی کار میں اسپتال جا پہنچی۔

جینی واقعی بہت کمزور ہوگئی تھی اور اس کمزوری کی وجہ سے اس پر غشی سی طاری تھی۔ آواز دینے پر آنکھ کھول کے دیکھ لیتی تھی۔

اسے دیکھ کر ہنی کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی اور جھک کر اسے پکارا تو دو تین آوازوں کے بعد جینی نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"جینی گڑیا! کیسی ہو تم؟" اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

جینی نے فوراً ہی آنکھیں بند کر لی تھیں، مگر اس کے سوال پر تھوڑا سا چونک گئی پھر ہنی کی طرف دیکھا، اور کچھ دیر ایک ٹک دیکھنے کے بعد اس نے اپنے ننھے ننھے سے ہاتھ اٹھا دیے۔ ہنی نے فوراً ہی اسے گود میں لے لیا۔

"کیسی ہو جان، مائی سوئٹ ڈول؟" وہ بڑے دلار سے بولی۔

جواب میں جینی نے سر اٹھا کر صرف "ممی" کہا اور پھر اس کے شانے پر چہرا ٹکا دیا۔

وہ سب کے سامنے اس کے ممی کہنے پر جھینپی تو بہت مگر اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے ممی کے الفاظ کوئی معنی ہی نہ رکھتے ہوں۔ اور اس تاثر کو ختم کرنے کی غرض سے بولی۔

"منو بے بی! کیا کھاؤ گی تم؟ جلدی سے بتاؤ۔

شاباش!"

مگر بے بی اس کے شانے سے لگی خاموش ہی رہی۔

"اسے جوس اور دودھ پینے کو کہا ہے ڈاکٹر نے، بسکٹ وغیرہ کھانے کو نہیں۔" آیا بولی۔

"وہ کیوں نہیں، جب تک اس کے پیٹ میں کوئی ٹھوس چیز نہیں جائے گی، یہ طاقت کیسے پکڑے گی۔ جاؤ تم باہر کینٹین سے بسکٹ کا پیکٹ لے کر آؤ۔" اس نے آیا سے کہا۔

سب خاموش کھڑے تھے۔

آیا نے سٹپٹا کر نعیرہ بیگم کی طرف دیکھا۔ تو وہ بولیں۔

"جاؤ نہ یہاں کھڑی ٹکر ٹکر سب کی صورتیں کیوں دیکھ رہی ہو، جاکر بچی کے لیے بسکٹ کا پیکٹ لے آؤ، مگر یہ کون سے بسکٹ لانے ہیں؟" نعیرہ بیگم نے اسے مخاطب کر کے پوچھا۔

ہنی نے بسکٹ کا نام بتا دیا اور جینی کو بستر پر لٹانے لگی، مگر جینی نے اس کی گردن کے گرد اپنی کلائیوں کا حلقہ سخت کر لیا۔ اس بات پر نعیرہ بیگم نے ہنس کر کہا۔

"لو دیکھو ذرا، کس بری طرح چمٹی ہے تم سے۔ یہ بےچاری تو اتنے دن سے تمہیں ہی ڈھونڈ رہی تھی۔" اور جواب میں اس نے جینی کو بہلاتے ہوئے کہا۔

"کم آن بے بی، اب اپنے بیڈ پر لیٹ جاؤ، چلو شاباش، نہیں تو میں چلی جاؤں گی۔"

اس کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ بچی نے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد اپنی کلائیوں کا حلقہ ڈھیلا کر دیا اور تھوڑا سا سر بھی اٹھا لیا۔ اس نے جلدی سے اسے اس کے بستر پر لٹا دیا۔

اسی اثنا میں آیا بسکٹ کا پیکٹ لے آئی تھی اور ادھر نرس نے اس کا فیڈر بھی تیار کر دیا تھا۔

جینی نے مشکل سے آدھا بسکٹ کھایا اور پھر فیڈر کی طرف اشارہ کیا، تو ہنی نے فوراً ہی اس کے منہ سے فیڈر لگا دیا۔

وہ سوا پانچ بجے جینی کے روم میں پہنچی تھی اور اب آٹھ بج رہے تھے۔ جینی نے اسے ایک منٹ کے لیے بھی نہیں چھوڑا تھا سو وہ اس تمام عرصے جاگتی رہی تھی۔ اور جب وہ واپسی کے ارادے سے اٹھی تو جینی نے رو رو کر سارا سر پر اٹھا لیا۔

اس وقت تک مراد بھی جو کہیں غائب رہے تھے، اس کے کمرے میں آ گئے تھے۔

نعیرہ بیگم بار بار یہی کہہ رہی تھیں کہ کہیں رونے دھونے سے بچی کو پھر بخار نہ ہو جائے۔

اور ادھر اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کالج کے پرنسپل کو درخواست بھجوا کر آئی تھی، ہوسٹل کی نگران سے تو اس نے کچھ کہا ہی نہ تھا۔ ادھر نو بجے ہوسٹل کا مین گیٹ بند کر دیا جاتا تھا۔ اگر دیر ہو گئی تو پھر وہ اندر کیسے جا سکے گی۔

بہر حال مراد نے اس مصیبت سے اس کی جان چھڑائی۔ انہوں نے جینی کو گود میں لے کر بہلانا شروع کیا اور پھر اسے لے کر باہر نکل گئے۔ تب کہیں جا کر اس کی جان چھوٹی۔

نعیرہ بیگم نے اسے ہوسٹل پر ڈراپ تو کر دیا تھا مگر تمام راستے اسے سمجھاتی رہی تھیں اور اسے اگلے دن ٹھیک پانچ بجے تیار رہنے کی تاکید بھی کر کے گئی تھیں، جس پر خواہ مخواہ اسے عمل کرنا پڑا تھا۔

اور اگلے روز پھر وہ اسپتال گئی تھی — اور حسب دستور جینی اس کے گلے کا ہار بن گئی تھی۔ اس روز اس نے جینی کو بسکٹ ہی نہیں بلکہ دلیہ بھی کھلایا تھا۔

جینی نے دودھ بھی بڑی رغبت سے پی لیا تھا، اور گزشتہ روز سے کہیں بہتر نظر آ رہی تھی۔

واپسی پر وہی گزشتہ روز والی ترکیب کی گئی، یعنی مراد جینی کو گود میں لے کر کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

اس روز وہ سات بجے ہی ہوسٹل واپس آ گئی تھی، کیونکہ گزشتہ روز بغیر اطلاع دیے چلے جانے پر ہوسٹل کی نگران نے اس سے خاصی باز پرس کی تھی۔

بہر حال اس طرح کئی روز تک وہ جینی کی عیادت کو اسپتال جاتی رہی، مگر اس طرح روز روز کے جانے سے جینی تیزی سے روبصحت ہو رہی تھی

وہاں اس کے لیے بہت سے مسئلے کھڑے ہو گئے تھے کہ ایک تو سارا شیڈول ہی بدل گیا تھا، دوسرے لڑکیوں کے درس و تدریس کے کام میں حرج ہونے لگا تھا۔ وہ دل جمعی سے کوئی کام بھی نہیں کر رہی تھی اور پھر نیند کی بھی بہت کچی تھی سو واپسی پر کھانے کا وقت ہو جاتا، اور کھانا کھانے کے بعد نیند اس پر اس قدر غلبہ کرنے لگتی کہ لے اپنی شاگردوں کی کاپیاں چیک کرنا اور اگلے دن کے لیے لیکچر اور کلاس ورک مشکل ہو جاتا۔

یہی دیکھ کر اس نے یہ ترکیب نکالی کہ کالج سے آکر لباس تبدیل کرنے کے بعد کھانا کھاتی اور پھر اپنے رجسٹر اور میگزین وغیرہ لے کر ہوسٹل کی بالائی گیلری میں جا بیٹھتی اور اس طرح ہوسٹل کی نگراں کو بھی پتا نہ چلتا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے۔

عظمت کی کار اسے لینے آتی تو یہی جواب ملتا کہ وہ ہوسٹل میں موجود نہیں ہے۔ اس طرح ایک ہفتہ بڑے سکھ چین سے گزر گیا اور یہ ترکیب بھی بڑی کارگر ثابت ہوئی کیونکہ تین چار روز سے عظمت کی کار بھی آنا بند ہو گئی تھی، اس لیے اب اس طرف سے اطمینان ہی اطمینان تھا مگر یہ اطمینان و سکون دو تین روز بعد سارا غارت ہو کر رہ گیا۔

وہ کالج جانے کے لیے تیار کھڑی تھی کہ مراد اچانک اس کے کمرے میں در آئے۔

”بلا اجازت اندر آ جانے کی معافی چاہتا ہوں۔“ انہوں نے آتے ہی معذرت پیش کر دی۔

وہ متعجب سی کھڑی سوچتی رہی کہ آخر وہ اس کے کمرے میں آ کیسے گئے۔ جب کہ ہوسٹل کی نگراں خاتون سے اجازت لیے بغیر کوئی صنفِ نازک بھی کمرے میں داخل نہیں ہو سکتی۔ کجا یہ کہ اتنا جسیم و ضخیم صنفِ ثقیل ۔۔۔ اس کے اندر چھپی ناگواری اور بیزاری اس کے خوبرو چہرے سے صاف عیاں ہو رہی تھی جسے مراد ایک ہی نظر میں بھانپ گئے تھے۔

انہوں نے فوراً ہی اپنی آمد کی غرض و غایت بیان کی۔

”میں اس وقت بہت مجبور ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ جینی کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔ اسے پچھلی رات میں نے پھر سے اسپتال میں داخل کرا دیا ہے۔ وہ آپ ۔۔۔ آپ کو بہت یاد کر رہی ہے۔ اس نے پھر کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ ہو سکتا ہے ضد کرنے کی وجہ سے ہی شاید اسے اتنا تیز بخار ہو گیا ہے۔“

”تو پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ یعنی جینی کا جو حال بھی ہوا ہے، وہ میری وجہ سے ہوا ہے۔ گویا اس کی ساری بیماریاں ہی میری وجہ سے ہیں۔ آخر یہ لوگ کیوں ایسے بے بنیاد الزام تراشی پر تلے ہوئے ہیں۔ کیا میں انہیں اتنی ہی بے وقوف اور فالتو نظر آتی ہوں۔“

اس کے گرم ہوتے دماغ میں خیالات کی ایک رو سی چلی۔ اور وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں ایک دم ہی پھٹ سی پڑی۔

”آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں مسٹر مراد! کہ کیا میں آپ کو بہت بے وقوف، غبی اور فالتو نظر آتی ہوں جو آپ سب کے سب جینی کے معاملے میں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں اور اس کی بیماری کا ذمہ دار مجھے ٹھہراتے ہیں۔ آخر آپ سب سمجھتے کیا ہیں کہ میں اتنی آسانی سے آپ کی اس بے جا یا وہ گوئی پر یقین کر لوں گی۔ کہ آپ کی بیٹی مجھ سے اتنی اٹیچڈ ہے کہ میرے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ انسان اگر جھوٹ بھی بولے تو اتنا بولے جسے دوسرا قبول کر سکے۔ میں آپ سے یہ پوچھتی ہوں کہ مجھ سے ملاقات ہونے سے پہلے آپ کی بچی کسے دیکھ کر اور کس کی گود میں پل کر یہ دو ڈھائی سال کا عرصہ گزارتی رہی تھی۔ عظمت کے یہاں میری آمد بھی بہت اتفاقیہ طور پر ہوئی تھی اور نہ ہوئی ہوتی تو پھر آپ اپنی بچی کو زندہ رکھنے کے لیے کس کا سہارا ڈھونڈتے؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی اس وقت آپ کی باتوں کا جواب ہی دے سکتا ہوں۔ میں تو اس وقت ایک ایمرجنسی میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ دیکھیں آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں اپنی انا، خودداری اور وقار کو ایک طرف رکھ کر آیا ہوں، آپ کو شاید معلوم نہیں کہ انسان کو اولاد کی خاطر اپنے مقام سے بھی گرنا پڑتا ہے۔“

اور وہ جو اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ یقیناً کوئی سنجیدہ صورت حال ہی ہے جو مراد کو خود آنا پڑا ہے۔ وہ تجاہل سے کام لے کر قدرے تیکھے لہجے میں بولی۔

”دیکھیں مسٹر مراد! مجھے فوری طور پر اپنی ڈیوٹی پر پہنچنا ہے لہٰذا لمبی چوڑی تمہید باندھنے سے بہتر یہی ہوگا کہ اصل مدعا بیان کریں۔“

”مدعا کیا بیان کروں محترم خاتون! دیٹ از اوبویس (وہ تو واضح ہے) میری بچی سخت مصیبت میں مبتلا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس وقت اور ابھی ابھی میرے ساتھ چل کر اسے دیکھ لیں۔ دیکھیں مجھے معلوم ہے کہ آپ کو کلاس لینی ہوگی اور آپ کا حرج بھی ہوگا، مگر ایک معصوم ننھی سی جان کو بچانا آپ کے اس فریضے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔“

”یعنی آپ کا مطلب ہے کہ میں اپنی یہ سروس چھوڑ دوں اور آپ کی بچی کی نگہداشت اور تیمارداری میں ساری عمر گزار دوں۔“ وہ ترش ہو کر بولی۔

”اگر ایسا ہو جائے تو پھر میرے نزدیک اس سے اچھی تو کوئی بات نہیں ہوگی۔“

مراد اس اتنی پریشانی میں بھی دل کی بات زبان پر لے آئے۔

”ہاؤ ۔۔۔ واٹ ۔۔۔ واٹ ڈو یو مین بائی آل دس۔ کیا آپ نے مجھے اپنی ملازمہ یا زرخرید سمجھ رکھا ہے۔ جائیے سیدھی طرح یہاں سے چلے جائیے۔ ورنہ میں نے اگر کسی سے کہہ کر آپ کو یہاں سے نکلوایا تو یہ آپ کے لیے اچھی بات نہیں ہوگی۔“

وہ ایک دم ہی غصے میں جھٹکے سے اٹھی اور مراد کو کمرے میں چھوڑ کر اپنا پرس لے کر باہر جانے لگی، تو مراد نے اس کے پیچھے آتے ہوئے بڑی لجاجت سے اسے پکارا۔

”نہیں بنی، پلیز میری بات تو سنیے“

وہ ایک دم ہی رک کر پلٹی اور کرخت لہجے میں بولی۔

”بنی نہیں، مجھے حنظل حبیب کہتے ہیں۔ کسی مرد کا کسی عورت کو بنی کہہ کر مخاطب کرنا معنوی لحاظ سے دوسری ہی نوعیت رکھتا ہے۔“ کچھ اس خیال سے اور کچھ غصے سے سرخ سی پڑ گئی تھی۔ تبھی تو اس کے لہجے میں تلخی اور کرختگی عود کر آئی تھی۔

اصل میں تو اسے اپنے اصل نام حنظل سے بہت چڑ تھی کہ یہ بھی عجیب سا کوئی نام تھا۔ جو اس کے والد نے جنہیں نت نئے نام رکھنے کا بہت شوق تھا، نامعلوم حنظل میں کیا خوبی دیکھ کر رکھا تھا۔ ہونہہ ۔۔۔ اتنا کڑوا کسیلا ۔۔۔ کسی خاص نوعیت کا حامل تو نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے تو اس نے حنظل کی جگہ اپنا نام بنی رکھ لیا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ جب وہ بہت چھوٹی تھی اور اپنی ماں کی ممتا کے گھنیرے سائے میں پرورش پا رہی تھی تو اس کے باپ نے لاڈ میں اسے بنی کہہ کر پکارنا شروع کیا تھا، اس لیے سارے خاندان والوں نے اس کا یہی نام مقرر کر لیا تھا۔ حنظل تو اسکول اور کالج کے رجسٹر میں درج تھا یا پھر شناختی کارڈ میں۔ اب یہ مراد اسے بنی کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ تو وہ بھلا کیسے برداشت کر لیتی۔

مراد اس کے لہجے کی کرختگی پر قدرے سٹپٹا کر بولے۔

”اوہ ۔۔۔ مس بنی ۔۔۔ بنی ۔۔۔ حنظل۔“ شاید اس کے نام کا تلفظ ادا کرنے میں مراد کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ ان کی بات سننے کے انتظار میں رکی رہی۔

”اپنی پریشانی میں اگر کوئی غلط بات میرے منہ سے نکل گئی ہو تو اس پر میں معذرت خواہ ہوں مگر یہ سمجھ لیں کہ اس وقت جینی کی دگرگوں حالت کے پیشِ نظر ہی وہاں سب سے کہہ کر آیا ہوں کہ میں ان ہی یعنی آپ کو ساتھ لیے بغیر نہیں آؤں گا۔ اس لیے آپ کو ہر صورت میں ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا، ورنہ ۔۔۔ میں آپ کو زبردستی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

مراد کی اس بات پر تو وہ بھنا ہی اٹھی۔

”واہ یہ اچھی زبردستی ہے۔ آخر آپ ہوتے کون ہیں مجھ پر جبر کرنے والے، آخر آپ کو کیا حق پہنچتا ہے مجھ پر دھونس جمانے کا۔“

”وہ آپ نے سنا نہیں، جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔“ مراد نے کہا۔

وہ آنکھیں نکال کر چیخی۔

”ہیں، کیا مطلب ہے؟“

"کوئی ضروری تو نہیں کہ ہر بات کا مطلب پہلے سے بیان کر دیا جائے، مگر آپ اتنی ہراساں نہ ہوں۔ میں نے یہ فقرہ اپنی بیٹی کی محبت میں بولا ہے۔ آپ سے اس کا دور تک بھی تعلق نہیں ہے۔ اچھا اب آئیے میرے ساتھ چلئے۔ میں کسی خوش وقتی میں تو نہیں آیا جو یہاں ٹھہرا باتیں ہی کرتا رہوں۔ اب آئیے پلیز جلدی چلیے۔"

مراد کے ملتجی سے انداز پر وہ قدرے نرم پڑ کر بولی

"مگر میں بھلا اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں؟"

"کیسے جا سکتی ہیں یا کیسے نہیں جا سکتیں، میں یہ سب نہیں جانتا، میں تو آپ کو لیے بغیر یہاں سے نہیں ٹلوں گا بس۔"

مراد کے تیور ایک دم ہی بدل گئے وہ ڈٹ کر بولے۔ آخر انہیں بھی اپنے رعیتے میں لچک پیدا کرنی پڑی۔

"وہ۔۔۔ ایسا کریں مسٹر مراد۔۔۔ ملاقات کا وقت تو پانچ بجے سے پہلے شروع ہوتا ہے ناں بس میں چلد بجے ہی اسپتال پہنچ جاؤں گی۔"

"جی نہیں آپ کو ابھی میرے ساتھ چلنا ہو گا، اگر ایسا نہ ہوا تو میں اپنی کنپٹی پر گولی مار کر خودکشی کر لوں گا کیونکہ میں آپ سب کے سامنے تنہا جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، باوقار اور باغیرت مرد کا قول بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ محترمہ جنی بیگم اس پر مستزاد میری بیٹی بستر مرگ پر پڑی ہے۔ یہ ریکویسٹ ڈاؤن ٹو ارتھ نوٹ۔۔۔ میرا مطلب ہے درخواست، اور وہ پرنسپل کو بھیج کر میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیے۔"

اُف! تو یہ کون سی مصیبت گلے پڑ گئی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا سوائے ہراسگی کے۔ کچھ دیر وہ خاموش کھڑی سوچتی رہی، پھر کمرے میں واپس پلٹ کر دروازہ کھولا۔ پین اور پیڈ نکالا اور درخواست لکھ کر اسے لفافے میں بند کر کے ہوتی باہر آ گئی۔ کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے شوفر سے کہا۔

"محمود حید خان! وہ سامنے نکڑ پر جو گرلز کالج ہے پہلے مجھے وہاں لے چلو۔"

شوفر نے جواب میں صرف گردن ہلا دی۔

بہر حال وہ کالج کی پرنسپل کو اپنی درخواست خود پہنچا کر کار میں آ بیٹھی اور چند ہی منٹ بعد ایک نئے تعمیر شدہ اسپتال میں پہنچ گئی۔

نصیرہ بیگم، وجیہہ اور عظمت کی بہن عصمت باہر لابی میں اُس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ مراد کو دیکھتے ہی نصیرہ بیگم نے کہا۔

"بڑی دیر کر دی بیٹا تم نے۔"

"کیا کرتا چچی اماں، ان کو اس وقت یہاں لانا جوئے شیر لانے سے کم تو نہیں تھا۔"

پھر وہ جنی سے آئیے کہتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

وہ بھی قدرے تامل کے بعد عصمت کو ساتھ لے کر اُن کے پیچھے چل دی۔

اسپتال کے چمکیلے فرش اور دیواروں کی کئی راہداریاں طے کرتی ہوئی عصمت اُسے لے کر ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ سامنے ہی مراد، جینی پر جھکے اُس کی پیشانی پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہے تھے۔

جینی دبلی ہو کر آدھی رہ گئی تھی اور تھوڑا سا منہ وا کیے بے سُدھ سی پڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر جنی کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ بھاگ کر جینی کے نزدیک چلی آئی۔

مراد اس اثنا میں سیدھے ہو کر نرس سے کچھ پوچھ رہے تھے۔

جنی نے بچی کی پیشانی پر اپنا ٹھنڈا اور نازک سا ہاتھ رکھا تو یوں ہٹایا جیسے ایک دم ہی اسے شاک سا لگا ہو۔

"اُفوہ! اُسے تو بہت تیز بخار ہے، کب سے پڑی ہے یہ اس حالت میں؟" اس نے ہراساں ہو کر نرس سے دریافت کیا۔

"ابھی دو تین گھنٹے پہلے تو ایڈمٹ ہوئی ہے بے بی۔" نرس نے بتایا۔

"اچھا تو پھر اس کا کیا ٹریٹمنٹ کیا آپ لوگوں نے۔ میرا مطلب ہے کیا تدبیر کی اس کا بخار ہلکا کرنے کی۔ میرے خیال میں تو ایک سو پانچ ڈگری سے زیادہ ہی ہو گا؟"

"وہ جی ڈاکٹر صاحب تو گیارہ بجے راؤنڈ پر آتے ہیں۔ ابھی بے بی کو چیک کر کے جو ٹریٹمنٹ بتائیں گے وہی ہم کریں گے۔"

"واہ! یہ بھی خوب رہی کہ جب ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آئیں گے اور جو بتائیں گے اس کے بعد ان کے امکانات پر عمل درآمد ہو گا۔ بظاہر تو یہ نیا اسپتال ہے مگر بڑا بوگس نظام ہے اس کا۔ خواہ مریض کی جان پر بن جائے یہ لوگ کوئی پرواہ ہی نہیں کرتے۔ اچھا تم کچھ نہیں کر سکتیں تو تھوڑی سی برف تو فراہم کر سکتی ہو تاکہ اس کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھی جا سکیں، ورنہ اتنے تیز بخار میں تو دماغ کی رگیں پھٹنے کا بھی امکان ہو سکتا ہے۔"

"دیکھیں جی! برف لانی تو بڑی بات ہم آپ کو کسی ٹریٹمنٹ کی اجازت بھی نہیں دے سکتے۔ بس ابھی تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب آتے ہی ہوں گے۔"

"واہ ٹوبیل ود یور ڈاکٹر۔۔۔ اگر خدانخواستہ اس تھوڑی دیر میں بچی کو کچھ ہو گیا تو میں تمہارے پورے اسپتال کو شوٹ کر دوں گی۔ چلو آیا ہم خود کہیں سے برف ڈھونڈ کر لاؤ۔"

اور مراد جو اتنی دیر سے خاموش کھڑے اس کی گفتگو سن نہیں رہے بلکہ اس کی گفتگو کو تول رہے تھے انہوں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"آیا کو بھیجنے کی ضرورت نہیں، میں خود جا کر برف لے آتا ہوں۔"

اور پھر وہ مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان کی واپسی کے وقفے تک جنی نے بچی کے تولیے کے دو تین ٹکڑے کیے۔ اسپتال کے ہی ایک تام چینی کے چھوٹے سے تسلے میں پانی بھروا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد مراد برف لے کر آئے تو اس نے برف کو تسلے کے پانی میں ڈال کر پانی کو خوب ٹھنڈا کیا اور اُس میں تولیے کے ٹکڑے بھگو بھگو کر بچی کے سر اور پیشانی پر اپنے ہاتھ سے رکھنے شروع کر دیے۔

"اگر برف زیادہ ہوتی تو میں اس کے جسم کو برف کے پانی سے اسفنج کرتی۔" جنی نے کہا۔

اور پھر انہیں بخار ہلکا کرنے کی ایک اور ترکیب بتائی۔ ایک ہاتھ کی ہتھیلی کو مراد ایک نرم سے کپڑے سے سہلانے لگے، دوسرے ہاتھ کو عصمت اور دونوں پیروں کے تلوؤں کو بیٹھ کر کے آیا نے سہلانا شروع کیا۔ یہ کام خاصا دیر طلب ثابت ہوا۔ یعنی کم از کم دس پندرہ منٹ تک جاری رہا۔

پھر تھرمامیٹر سے بخار دیکھا گیا۔ صرف دو ڈگری ہی گرا تھا۔ یعنی ایک سو چار ڈگری رہ گیا تھا۔ تبھی ڈاکٹر بھی آ گیا۔ اس نے برف کی پٹیاں ہٹوا دیں۔ بڑے غور سے بچی کا معائنہ کیا اور پھر اپنے بیگ سے ایک انجکشن نکال کر خود اپنے ہاتھوں سے بچی کو لگایا اور مراد سے کہنے لگا۔

"آپ فکر نہ کریں بے بی کا بخار ڈیڑھ دو گھنٹے میں کم ہو جائے گا۔ یہ کچھ سیرپ اور گولیاں ہیں، بخار کم ہونے پر یہ بچی کو کھلا دیجیے گا۔" پھر وہ نسخہ دے کر چلا گیا۔

پھر دو تین گھنٹے بعد جینی کا بخار کم ہو کر ایک سو ڈگری رہ گیا۔ مگر غنودگی پھر بھی طاری رہی۔ شاید یہ کمزوری کی وجہ سے تھی مگر مراد اس پر بڑے ہراساں ہو رہے تھے۔

یوں دیکھتے دیکھتے وقت گزرتا رہا اور شام کے سات بج گئے۔ بچی کی حالت کی طرف سے کوئی بھی مطمئن نہ تھا۔ مراد اس پریشانی میں بہت تھکے تھکے سے اور مضمحل سے نظر آ رہے تھے۔ جنی دیکھ کر اس کے نرم سے دل میں ہمدردی کی ایک لہر سی اٹھی۔ اس نے عصمت سے کہا۔

"میرے خیال میں تمہارے بہنوئی کو بھی اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔ انہیں تم اپنے ساتھ گھر لے جاؤ۔ میں رات کو بے بی کے ساتھ رہ لوں گی۔"

اور عصمت کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے بڑی طرح آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

"کیا واقعی؟"

"ہاں بھئی تو اور کیا میں مذاق کر رہی ہوں۔ ویسے بھی کل ہفتے کا دن ہو گا اور میرا کالج سینئر کلاسز کے لیے ہفتے کو بند رہتا ہے۔"

"او گڈ!" عصمت نے تالی بجانے کے انداز میں ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور پھر اس کا مشورہ مراد کے گوش گزار کر دیا۔

وہ تو خدا سے یہی چاہتے تھے۔ فوراً ہی عصمت کے ساتھ گھر جانے کے لیے راضی ہو گئے۔

نصیرہ بیگم اسپتال میں جنی کے داخلے کے وقت چونکہ سویرے آ گئی تھیں، اس لیے اندر جانے کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے وہ باہر ہی باہر گھر چلی گئی تھیں۔

بچے کی مثال ننھے سے نودمیدہ پودے کی طرح ہوتی ہے جو اگر ذرا سی تپش سے کملا جاتا ہے تو ہلکی سی ٹھنڈک اور آبی چھینٹا پڑنے سے تروتازہ بھی ہو جاتا ہے۔

کئی روز گزر گئے تھے۔ جینی کا بخار بھی اتر گیا تھا لیکن کمزوری سی باقی تھی۔ ہنی نے بڑی محنت اور لگن سے اس کی تیمارداری کی تھی۔ اس کی خاطر کالج سے چند یوم کی چھٹی بھی لے لی تھی۔ مراد بے فکر سے ہو گئے تھے اور بس ایک بار ہی بیٹی کو دیکھنے آسکے تھے جب کہ نصیرہ بیگم بیٹی اور بھانجی کے ساتھ بڑی پابندگی سے ملاقات کے اوقات میں آتیں اور تیزی سے روبصحت ہوتی نواسی کو دیکھ کر ہنی کی تعریفوں کے پل باندھ دیتی تھیں۔ ان کے احسانوں کو اس قدر جتاتی تھیں کہ وہ شرمندہ ہو جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی نصیحتوں کے ڈوز بھی پلاتی رہتی تھیں۔

"لینے کو تو سب ہی لیتے ہیں مگر جو دوسروں کے لیے جیتے، اس کی عظمت کردار کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہوتا اور تم جینی کے لیے یہ جو کچھ بھی کر رہی ہو تمہارا یہ احسان تو ہم کبھی اتار ہی نہیں سکتے۔ تم نے تو ایک طرح سے ہم سب کو خرید لیا ہے۔"

"ذرا دیکھو، غور تو کرو، تمہیں دیکھ کر اس بچی میں کیسی جان آ جاتی ہے۔ اب یہ جو تیزی سے روبصحت ہو رہی ہے تو صرف تمہاری موجودگی اور اس پر اتنی محنت کرنے کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ میں نے تو اس روز جس دن مراد میاں تمہیں لینے گئے تھے۔ انہیں بہت منع کیا تھا کہ دیکھو ہنی کو بلا کر نہ لاؤ کیونکہ اس کا آنا تو جینی کے لیے حیات بخش ثابت ہوگا، مگر اس کی واپسی اس معصوم بچی کے لیے بڑی اذیت کا باعث ہوگی اور ہنی اور تمہاری کی کرائی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ جب وہ ہنی کے بچھڑنے میں پھر بیمار ہوگی۔ مگر وہ مانے ہی نہیں لینے گئے۔

"مجھے اماں! پہلے میری بچی کے اندر زندہ رہنے کے امکانات تو پیدا ہو جائیں۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ کیا ہوگا اور کیا نہیں اور میں چپ ہو گئی کہ داماد پر میرا کوئی بس تو نہیں چلتا نا بیٹا۔

ویسے تو بیٹی! میرا تم سے کوئی رشتہ تو نہیں بنتا تمہاری چچی کی بہن ہی ہوں ناں، مگر تم مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح ہی عزیز ہو۔ اور مجھے معلوم ہے کہ باپ اور چچاؤں وغیرہ کے ناروا سلوک نے تمہیں مرد ذات سے متنفر کر دیا ہے مگر بیٹی۔۔۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ

نہ ہر مرد نہ ہر زن است
خدا پانچوں انگشت یکساں نہ کرد

تو واقعی جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح ہر مرد تمہارے باپ اور چچاؤں جیسا نہیں ہوتا۔ اب اپنے چچا فاروق کی ہی مثال لے لو، وہ تمہیں بالکل عظمت اور عصمت کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ ویسے بھی بیٹی مرد کے بغیر عورت کی مثال بغیر چھت کے مکان کی سی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے تو مرد کو عورت کا سائبان کہا جاتا ہے۔ یوں بھی عورت خواہ لاکھ شادی نہ کرے اور تنہا مردانہ وار زندگی گزارنے کے دعوے کرتی رہے۔ زندگی میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب اسے مرد کی کمی کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ مرد کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ مرد عورت کا سائبان ہوتا ہے۔ اس کے دکھ درد میں زندگی بھر کا شریک اس کا محافظ اور مختار کل۔ اسے اولاد کا تحفہ دینے والا۔

مگر جب ایسا احساس جاگتا ہے تو وقت آگے نکل جاتا ہے کہ عورت کے لیے مرد کا حصول محال ہو جاتا ہے۔ دیکھو بیٹی میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارا باپ، تمہارے نہ بھائی اور چچا۔ مل بے چاری کو تو جان کر تم بچوں کی صورتوں کو ترسایا گیا ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم شادی کر لو، چلو مراد سے نہیں کسی اور سے ہی سہی۔ تاکہ یہ اتنی بڑی زندگی آرام سے گزر جائے۔ بیٹی آخر کب تک پڑھاتی رہو گی۔ ایک سال دو سال، تین سال، دس سال۔ پڑھاتے پڑھاتے بوڑھی ہو جاؤ گی۔ تب بھی تمہیں چین نہیں ملے گا۔ اور جینی کو تم نے اتنا سر چڑھا لیا ہے کہ وہ تمہارے سامنے باپ کو بھی نہیں گردانتی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بچی کا آخر کیا انجام ہوگا۔ باپ نے کسی عورت سے اگر دوسری شادی بھی کر لی تو اس بے چاری بے ماں کی بچی کا کیا بنے گا، کیونکہ سوتیلی ماں تو کبھی تم جیسا پیار نہیں دے سکے گی بلکہ وہ تو مراد میاں کو بھی سوتیلا باپ بنا دے گی۔ جیسا تمہارے باپ کو بنا دیا تھا تمہاری سوتیلی ماں نے۔ حالانکہ سنا ہے کہ تم چھوٹی تھیں اس لیے تمہارا باپ، تمہارا بہت خیال رکھتا تھا۔ مگر ایک تو دوسری بیوی سے اولاد نہ ہو جانے کی وجہ سے دوسرے تم بچوں کے خلاف سوتیلی ماں کے زہر اگلنے کی وجہ سے تمہارا باپ تم سے ہی بالکل بدل گیا تھا۔ اب مراد میاں جینی کی محبت کا جتنا دم بھرتے ہیں سوتیلی ماں کے آنے کے بعد انہیں بھی دیکھ لینا کیا کرتے ہیں۔ آہ نا معلوم اس میں قدرت کی کیا مصلحت تھی کہ ماں کو اٹھا لیا اور بچی کو جلا دیا بلکہ ہم سب کے لیے اسے ایک مسئلہ بنا دیا۔"

بات کے اختتام پر نصیرہ بیگم نے آنسو پونچھے تو حنظل کو یوں لگا جیسے ان کی آنکھوں سے بہتے آنسو اس کے دل میں خون کے قطرے بن کر ٹپک رہے ہوں۔

اس روز ہوسٹل آتے ہوئے اس نے مراد سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر نصیرہ بیگم کی اتنی نصیحتوں کے باوجود چونکہ مرد ذات سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا، اس لیے اس کا دل کسی طور پر بھی مراد کو شوہر کی حیثیت سے ملنے پر تیار نہیں ہوا۔ یعنی اب وہ بچی تو نہیں تھی کہ اسے اتنا بھی علم نہ ہوتا کہ ازدواجی زندگی کن خطوط پر استوار ہوتی ہے۔

یوں بھی مراد کو تو صرف ایک آیا یا گورنس کی ضرورت تھی۔ خاص طور پر اس کی شکل میں ایک دو مرتبہ وہ کہہ بھی چکے تھے کہ وہ صرف اور صرف اپنی بیٹی کی حنظل کے ساتھ اتنی محبت کی وجہ سے اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور اسی وجہ سے انہوں نے اس سے کہلوا دیا تھا کہ اس سلسلے میں وہ جو شرط چاہے پیش کر سکتی ہے جسے قبول کرنے میں انہیں بالکل کوئی اعتراض نہیں ہوگا، مگر جب یہ سب کہلوایا گیا تھا تو وہی شل تھی کہ بنیا تو لتا نہیں اور کہتے ہیں پلڑا نہ مارے۔ اس نے صاف صاف کہلوا دیا تھا کہ شرط تو معمولی سی بات ہے، آپ اگر الٹے توے پر بیٹھ کر بھی اپنی وفاداری کی قسم کھائیں، تو میں کسی قیمت پر بھی یقین نہیں کروں گی۔

مگر اب معاملہ کچھ دوسری ہی نوعیت اختیار کر گیا۔

کچھ نصیرہ بیگم کی آہوں میں ڈوبی گریہ زاری اور کچھ ان کی مایوسانہ باتوں کا اثر اور سب سے بڑھ کر جینی کا اپنے ساتھ اتنا زیادہ اٹیچمنٹ، انہی ساری باتوں نے اسے مراد سے نکاح کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور چونکہ اسے معلوم تھا کہ نکاح کے بعد مرد، عورت کے تمام تر جملہ حقوق کا مالک ہو جاتا ہے اور اپنے شوہرانہ حقوق کی روشنی میں دھونس۔ جبر و زبردستی سے بھی کام لیتا ہے اس لیے تب سوچ سمجھ کر عذیر کے بقول اس نے یہ اصول پسند شرائط رقم کرائی تھیں، یا پیش کی تھیں۔ جنہیں مراد نے بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہوئے اپنی صرف دو ہی شرائط رکھی تھیں۔ اور وہ یہ تھیں۔

وہ جب بھی لندن سے کراچی آئیں ان کی بچی کو ان سے ملنے کے لیے جہاں وہ بلائیں وہاں بھیج دیا جائے اور یہ بھی کہ شادی کے بعد وہ سروس کرے گی نہ ان کے علم میں لائے بغیر کہیں جائے گی۔ جو اس نے بلا تامل قبول کر لی تھیں۔

عظمت اس سے اسی روز سے خفا تھی کم ہی اس کے سامنے پڑتی تھی۔ اس کی خفگی دور کرنے کی غرض سے اپنی تمام شرائط اسی کے ذریعے اس نے مراد کو بھجوائی تھیں۔ مگر چونکہ حنظل نے عظمت کو سختی سے پابندی کر دی تھی کہ ان شرائط کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے کیونکہ یہ اس کا اور مراد کا نجی معاملہ ہے۔ اس لیے عظمت نے ماں اور خالہ کو یہ کہہ کر اس راز کو افشا کرنے سے باز رکھا تھا کہ اتنی مشکلوں سے تو وہ قابو میں آئی ہے اگر اسے یہ پتا چل گیا کہ میں نے آپ لوگوں کو بھی بتلا دیا ہے تو وہ ایک دم ہی کھونٹے سے اکھڑ جائے گی۔ آپ بے فکر رہیں مراد بھائی، خود اس معاملے کو سنبھال لیں گے۔ تب کہیں جا کر وہ خاص طور پر نصیرہ بیگم خاموش ہو گئی تھیں۔

پھر خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ گیا، جس کا مراد کو انتظار تھا۔

رسم نکاح شرائط کے مطابق چھپ کے بجائے کل پانچ افراد کی موجودگی میں انجام پائی تھی۔ ایک عظمت کے والد فاروق حسن، دوسرا عظمت کا بھائی، تیسرا عذیر جو تھا اس کا کولیگ، جو اتفاق سے اس کے

سامنے آگیا تھا۔ اور فاروق حسن کے ایک واقف کار۔ چھٹا فرد تو ڈھونڈنے نہیں ملا تھا اور اس کی اتنی ضرورت بھی نہ تھی۔ مراد تو اکیلے ہی آئے تھے۔
انہوں نے ہنی کی رہائش کے لیے اپنے ڈیفنس سوسائٹی کے بنگلے کو سیٹ کرا دیا تھا۔ نعیمہ بیگم انڈیا سے آئی ہوئی اپنی بھانجیوں وجیہہ اور عائکہ کے ساتھ گزشتہ روز ہی وہیں چلی گئی تھیں۔ جبنی کو بھی مراد ان کے پاس ہی چھوڑ کر آئے تھے۔ نکاح کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی نہیں رکے۔ عذیر اور اس کے کولیگ کے ساتھ کہیں چلے گئے تھے۔
ہنی کا کراچی میں تو اپنا کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ ہوٹل کی رہائش وہ دو روز قبل ہی چھوڑ چکی تھی۔ بس عظمت کا گھر ہی اس کا میکہ تھا۔ گو نکاح کے بعد اس کا اپنے گھر میں ٹھہرنا صغیرہ بیگم کو سخت گراں گزر رہا تھا پھر بھی انہوں نے مصلحتاً اسے بالکل نہیں ٹوکا۔
اگلے روز صبح ہی صبح اٹھ کر وہ تیار ہوئی، ناشتا کیا اور ـــــ کہیں جانے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ ڈیفنس ـــــ مراد کے گھر سے عائکہ کا فون آگیا جسے اتفاق سے اسی نے ریسیو کیا۔
”ہیلو! ارے واہ! آپ بول رہی ہیں، کیسے کیسے مزاج ہیں آپ کے بھابی جان؟“ عائکہ رشتے میں چونکہ مراد کی کزن تھی۔ اسی رشتے کی مناسبت سے اس نے اسے بھابی جان کہہ کر پکارا تھا۔
”نہیں بھئی، میں بھابی جان تو نہیں، ہنی ہوں، شاید تم نے کسی اور کے دھوکے میں ــــ“
”نہیں ہنی بھابی، میں آپ کو ہی بھابی جان کہہ رہی ہوں۔ مراد بھائی میرے بھی کزن ہیں نا ــــ اچھا خیر ادھر آپ کی تشریف آوری کب تک ہوگی۔ خالہ اماں بے چاری تو کل سے آپ کی راہ دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھیں پتھرا بنالی ہے۔“
”بس ابھی آ رہی تھی ویسے ـــــ“ اصل میں وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ مراد تو وہاں موجود نہیں ہیں مگر پھر یہ سوچ کر اس نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ اگر غلطی کی پابندی شک کی ہے۔ تو پھر وہ خود ان سے نمٹ لے گی۔ اس نے بات گھمادی۔
”تم، ازی اور عصمت کو اپنے ساتھ ہی لا رہی ہوں۔“
”او کے، موسٹ ویلکم۔“ عائکہ نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔
اس نے عائکہ سے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ وہ ازی اور عصمت کو بھی لا رہی ہے۔ مگر اب الٹے یہ کھٹکا لگ گیا کہ کسی طور پر گوارا نہ ہوا کہ وہ جہاں جا رہی ہے، وہ دونوں بھی اس کے ساتھ چلیں۔ وہ تو ماں کے کہنے پر ازی نے خود اس سے پوچھا۔
”ہنی، آخر تمہارا کیا ارادہ ہے۔ کیا آج بھی اپنے پیا کے گھر نہیں جاؤ گی۔ جب کہ اطمینان رکھو۔ مراد بھائی ہمارے گھر سے ہی سیدھے عذیر بھائی کے یہاں شفٹ ہو گئے ہیں۔ وہ اپنی جان سے بڑھ کر تمہاری ساری شرائط کی پاسداری کریں گے سمجھیں؟“
”او یس ہی از بائونڈ ٹو۔“ ہنی نے کچھ ایسی نرخی سے کہا کہ عظمت اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔
”اچھا اب کسی طرح اپنی سسرال تو چلی جاؤ۔“ ازی نے کہا جو چاہ رہی تھی کہ وہ جلد سے جلد مراد کے گھر پہنچ جائے۔
”ہاں وہیں جانے کے لیے تو تیار ہوئی ہوں، مگر ڈیئر، وہاں جانا بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔ آل مین ــــ“
”یعنی تمہیں شرم آ رہی ہے، تم یہی کہنا چاہ رہی ہو ناں۔ چلو تو ایسا کرتی ہیں کہ میں تمہیں چھوڑ آتی ہوں۔ یوں بھی کورے بدن کی نئی نویلی دلہن کو تنہا پی کے گھر نہیں جانا چاہیے۔“ ازی نے آخری فقرہ شوخ سی معنی خیزی سے کہا۔
”چلو ــــ چلو اب زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کرو بے ہودہ کہیں کی۔“
وہ تھوڑا سا جھینپ کر بولی۔
”اُفوہ! ابھی اتنا چلو چلو کر رہی ہو تو چلی ہی چلتی ہوں۔ مگر پہلے کپڑے تو بدل لو۔ یا پھر یوں ہی سر جھاڑ منہ پہاڑ چلنے کا ارادہ ہے۔“ ازی نے اس کا فقرہ پکڑتے ہوئے دانستہ اس کے سادہ سے لباس پر چوٹ کی۔
”ارے تو ان کپڑوں میں بھلا کیا خرابی ہے ڈیئر کزن جب کہ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں نے ــــ“
”کنواری بیوہ کا روپ دھارا ہے۔“ عظمت نے

جل کر اس کا فقرہ پورا کیا اور پھر اس ڈر سے کہ کہیں وہ خفا ہو کر مراد کے گھر جانے سے انکار ہی نہ کر دے۔ وہ زبردستی کی زور زور سے ہنسنے لگی۔
”اچھا اچھا اب اتنی کھیسیں بھی نہ نکالو، میں سب سمجھتی ہوں تمہاری باتوں کو۔ تم اب تیار ہو جاؤ ـــــ عصمت کو بھی لے چلنا اپنے ساتھ، ورنہ وہ یقیناً مائنڈ کرے گی۔“
عظمی اس کے ہنسنے پر سنجیدہ ہو کر بولی۔
”تو کیا میں سوتیلی ہوں تمہاری جو مجھے نہیں چھوڑ کر جاؤ گی ہنی بیٹا۔“
صغیرہ بیگم جو کچھ دیر قبل ہی اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہوئی تھیں، انہوں نے مشفق سے لہجے میں کہا۔ اس سمے واقعی شرم سے اس کی لویں سرخ پڑ گئیں۔
”چچی جان دوسرے گھر میں جانے کے لیے کسی لڑکی کو اپنے بزرگوں سے تو نہیں کہنا پڑتا۔“ اس نے لجاتے ہوئے انداز میں کہا۔
”ہاں بیٹا تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی۔ اصل میں تو عقل میری ہی ماری گئی تھی، ورنہ مجھے تو تمہاری اپنے بزرگوں سے محرومی کے پیش نظر خود ہی تمہیں تیار کرا کے وہاں لے جانا چاہیے تھا۔ ذرا دیکھو تو بھتیجو! اپنے اتنے سارے سگوں کے ہوتے ہوئے بیٹی آج اپنی زندگی کے سب سے اہم موڑ پر خود کو کس قدر تنہا اور بے بس محسوس کر رہی ہوگی۔ لیکن بیٹی میں تمہاری ماں ہوں نہ قریبی عزیزہ، تمہارے رشتے کے چچا کی بیوی ہی ہوں۔ مگر میرے دل میں تمہارے لیے بڑی ہمدردی اور محبت ہے۔ میں تمہیں ان دونوں بچیوں کی طرح ہی عزیز رکھتی ہوں۔“ صغیرہ بیگم نے یہ سب کچھ اتنی محبت سے کہا کہ ہنی ان سے لپٹ کر بولی۔
”مجھے بھی آپ کے اندر ماؤں جیسی خوشبو آتی ہے چچی جان۔“
”ہاں صدقے میری بچی۔ تم آئندہ مجھے ماں ہی کہنا۔“ صغیرہ بیگم نے اسے بھینچ کر گلے سے لگاتے ہوئے کہا تو اس کی خوبصورت آنکھیں نم ہو گئیں۔
”جاتی ہو، ماں کا رتبہ کیا ہوتا ہے بیٹی۔ میں اگر ان دونوں سے کچھ کہوں اور یہ میری بات نہ مانیں تو میں ان کے کان اکھیڑ کر ان کے ہاتھوں میں دے سکتی ہوں سمجھیں تم۔ اور اب میں تم سے کہتی ہوں کہ تم یہ بیکار سے کپڑے اتار کر وہ کپڑے پہنو جو میں نے اس خوشی کے موقع پر تمہارے لیے بڑے چاؤ سے تیار کرائے ہیں۔“
صغیرہ بیگم نے کہا تو اس نے سٹ پٹا کر ادھر ادھر دیکھا۔ شرائط نامے میں صاف لکھوا چکی تھی کہ وہ سادے اور اپنی مرضی کے لباس زیب تن کرے گی۔ مگر اب صغیرہ بیگم ماں بن کر اسے ایک غیر امکانی بات پوری کرنے کا حکم دے رہی تھیں۔ اور یہ بات اسے اتنی ناگوار گزر رہی تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ صاف انکار کر دے۔ بھلا یہ تو کھلا دھوکا تھا جو اسے دیا جا رہا تھا کہ پہلے تو ساری شرائط بلا چون و چرا مان لی گئی اور اب اس کے بعد بزرگوں سے زور ڈلوایا جا رہا ہے۔ وہ ابھی اسی گو مگو کی کیفیت میں مبتلا تھی کہ صغیرہ بیگم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے کہا۔
”بیٹی تمہاری شرط سر آنکھوں پر مگر یہ بھی تو سوچو کہ بھلا کوئی نئی نویلی دلہن اس طرح ویران اور اجاڑ حلیے میں بھی کہیں دیکھی گئی ہے۔ اب وہاں نا معلوم کون کون آیا ہوا ہو یا آجائے۔ یہی پاس پڑوس یا پھر عذیر اور اس کے دوست کی فیملی۔ تو وہ بھلا کیا سوچیں گے تمہیں ان ــــ سادے کپڑوں میں دیکھ کر۔ یوں بھی یہ شرائط وغیرہ کا معاملہ تو تمہارا اور مراد کا نجی معاملہ ہے۔ اسے کسی پر ظاہر تو نہیں کرنا چاہیے۔ چلو جاؤ شاباش۔ جا کر لباس تبدیل کر لو۔“
صغیرہ بیگم کے آخری فقرے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہے۔ اس کے باوجود وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آخر عظمت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے زچ ہو جانے کے سے انداز میں کہا۔
”افوہ بھئی اب چلو بھی کسی طرح میرے کمرے میں۔ آؤ میں تمہیں دلہن بنا دوں۔ پتا ہے میں نے بیوٹیشن کورس کر رکھا ہے ایسی دلہن بناؤں گی کہ تم پہچانی نہیں جاؤ گی۔“
”ہاں ہاں جلدی سے میری بچی کو تیار کرا دو۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔“

صغیرہ بیگم کے ساتھ کار میں بیٹھ کر ڈیفنس روانہ ہوگئیں
وہاں پہنچیں تو مراد کا پُرشکوہ بنگلا دیکھ کر جینی کی
آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ عمارت
کی پیشانی پر خنظل پیلس لکھا ہوا تھا۔ پھر جونہی کار عمارت
کا وسیع و طویل احاطہ طے کر کے پورچ میں رکی۔ نصیرہ
بیگم، دونوں بھابیوں اور دو تین اجنبی صورتوں کی لڑکیوں
نے بڑی گرم جوشی سے اس کا سواگت کیا۔
پہلے تو نصیرہ بیگم نے اس کے قدموں کے آگے ایک
بکرا ذبح کرا کے صدقہ کرایا۔ پھر دو دفعہ خنظل کے
پیسے وارے، اور اسے پھولوں کا گہنا پہنا کر پانچ سو
روپے کا صدقہ اتارا۔ بعد سہاگ کے گیت گاتی
ہوئی لڑکیوں کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ رکھ
کرا سے اندر لے آئیں جہاں مزید دو تین خواتین بیٹھی
تھیں۔ بہرحال جو رسومات رخصتی کے بعد سسرال
میں انجام پاتی ہیں وہ بھی ساری رسمیں نصیرہ دولہا کے
خنظل پیلس میں ادا کی گئیں۔
نہ معلوم نصیرہ بیگم نے دولہا کے بارے میں کیا کہا
تھا۔ اسے تو انہوں نے نہیں بتایا کہ انہوں نے مصلحتاً
جینفر کو مراد کے پاس ایک دو روز رہنے کے لیے بھیج
دیا ہے۔ تاکہ یہ جو اجنبی مہمان خواتین اس وقت وہاں
موجود ہیں انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ مراد کی یہ دوسری شادی
ہے اور جینی کی تم سوتیلی ماں ہو۔
بہرحال رات کو کھانا کھانے کے بعد صغیرہ بیگم
دونوں بیٹیوں کے ساتھ اپنے گھر سدھار گئیں۔ نصیرہ بیگم
البتہ دو تین روز اس کے ساتھ رہیں۔ پھر وہ بھی دونوں
بھابیوں کے ساتھ اپنے گھر ملتان چلی گئیں۔ جینی کو مراد
نے ان کی موجودگی میں ہی گھر بھیج دیا تھا۔ ان کے جانے
کے بعد صرف وہ اور جینی ہی گھر میں تنہا رہ گئی تھیں۔
یوں تو آیا کے علاوہ ایک عدد ملازم، خانساماں،
مالی، ڈرائیور اور چوکیدار بھی اس گھر میں موجود رہتے
تھے مگر ملازمین بھلا کب مالکوں کو کمپنی دے سکتے ہیں۔
آیا بھی جینی کو ہی اٹینڈ کرتی تھی۔ مگر تھی بہت نیک حلال
اور وفادار قسم کی عورت۔ جینی پر تو جان چھڑکتی تھی۔ اور
خنظل کا بھی بہت خیال رکھتی تھی۔
بہرحال گھر۔ گھر کی ہر شے۔ حتیٰ کہ نئی زندگی۔ یہ سب
کچھ اس کے لیے کسی نئے تجربے سے کم نہ تھیں۔ ایک تو

پڑا گھر ہی ینشرلی اے سی تھا۔ اس پر گھر کا ایک گوشہ
اس قدر آراستہ و پیراستہ۔ آنا قیمتی اور اعلیٰ فرنیچر، جدید
ڈیل ڈیکوریشنڈ کمروں میں ٹی۔ وی اور وی سی آر۔ مہنگا
ترین ڈش انٹینا اور ڈرائنگ ڈائننگ تو کسی شاہی
محل کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ ادھر ہر دم مستعد اور حکم کے
منتظر رہنے والے ملازمین۔ انواع و اقسام کے کھانے
اور مشروبات وغیرہ۔ غرضیکہ ہر چیز ہی اس کے لیے نئی
اور فرحت بخش تھی۔
اسے واقعی زندگی میں پہلی بار پوری خودمختاری
اور عزت کے ساتھ یہ اتنی ساری آسائشیں نصیب ہوئی
تھیں۔ اس پر بے محابہ سکون و آرام۔ وہی شکل تھی کہ

صغیرہ بیگم نے اپنے کمرے کا رُخ کرتے ہوئے
کہا۔ تب وہ عظلت کے زور زور سے ہاتھ کھینچنے پر
بڑے شکراہ کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس
کے کمرے میں آگئی۔ جہاں پہلے سے ہی اس کے
پہننے کے لیے عروسی لباس اور زیورات رکھے ہوئے
تھے۔ کپڑے تو خیر پیٹرمی سیڑھی شکلیں بنا کر اس نے
خود ہی پہن لیے مگر میک اپ بھی بڑی مشکل سے کرایا
اور زیور بھی سو نخروں سے پہنا۔
اسی کام میں تقریباً پندرہ منٹ لگ گئے تھے۔
ادھر سے نصیرہ بیگم کے فون پر فون آ رہے تھے اسی
لیے صغیرہ بیگم اور عصمت بھی جلد جلد تیار ہو کر عظلت
کے کمرے میں آئیں تو بہن کا عروسی جلوہ دیکھ کر عصمت
نے ہائے اللہ کہہ کر سینے پر ہاتھ رکھا اور جھومتا کر عظلت
کے بستر پر جا گری۔ ماں اور بہن دونوں ہی اس کے
گرنے سے پریشان ہوگئیں۔ صغیرہ بیگم نے دہل جانے
کے سے انداز میں اس پر جھکتے ہوئے پوچھا۔
"ہائے کیا ہوا میری بچی کو؟" ماں بھی پریشان
سی ہو کر بیڈ کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔ عصمت نے
نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
"آج یہ اپسرا ہمارے گھر میں کیسے اتر آئی امی۔
میں تو اس کا جلوہ دیکھ کر چاروں خانے چت ہوگئی"
اس پر صغیرہ بیگم نے غصے سے اسے ایک چپت
لگاتے ہوئے کہا۔
"چل شریر کہیں کی۔ مجھے تو تم نے دہلا کر ہی رکھ دیا"
"ہاں تو کیا کرتی امی۔ یہ رنگ ہی کچھ ایسی رہی ہیں
ایمان سے مراد بھائی اگر ان کا یہ عروسی جلوہ دیکھ لیں تو
کام سے بالکل ہی جاتے رہیں" عصمت نے آنکھیں
پٹ پٹاتے ہوئے کہا۔ اور اس ڈر سے کہ کہیں مراد کا نام
سن کر وہ کپڑے اور زیور اتار کر گھر میں نہ بیٹھ جائے
اسے ڈانٹا۔
"چپ ہو جاؤ بدتمیز۔ ہمیشہ الٹی فول ہی بکتی رہتی
ہو"
"بیمے اس میں اول فول بکنے کی بھلا کیا بات۔ میں
تو جو حقیقت ہے وہی بتا رہی ہوں۔ کیوں بھابی
جان" اس نے آخری فقرہ خنظل کو مخاطب کرکے
کہا۔

"ہائیں بھابی جان۔ انہیں بھابی جان کیوں کہہ رہی
ہو جبکہ یہ تو ہر لحاظ سے تمہاری بہن ہی ہوتی ہیں"
عظلت نے پھر ٹوکا۔
"وہ تو ہوتی ہی ہیں مگر تھوڑی دیر کو مجھے اپنی نند
فرض کر لیں تاکہ میں ان سے تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ بھی
کر لوں۔ ورنہ بھئی بہن کی وہ بھی بڑی بہن کی حیثیت
سے تو یہ الٹی مجھے ڈانٹ ہی پلا دیں گی۔ سچ مچ بڑی
ویری ہارڈ" عصمت نے ڈرنے کے سے انداز میں
جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔
"دیکھا امی آپ نے یہ عصمت کتنی بدتمیز ہوگئی
ہے" عظلت سے اس کی بات کا جواب نہ بن سکا تو
اس نے ماں سے اس کی شکایت کی۔ جو بہن کی پیشانی
پر سجانے کی غرض سے مخملیں ڈبیہ میں سے جڑاؤ ٹیکا
نکال رہی تھیں۔ انہوں نے نگاہیں اٹھائے بغیر
کہا۔
"چلو عصمت ان بیکار باتوں میں وقت ضائع نہ کرو
اور جلدی سے تیار ہو جاؤ"
"لو مجھے تیار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ بس یہی
ڈریس ٹھیک ہے۔ جو اس نے پہن رکھا ہے۔ ویسے
بھی وہاں کوئی ہوگا تو نہیں" عظلت بولی۔
"ہاں ہاں ٹھیک ہے پھر تو میں اسی سوٹ پر دوپٹا
اوڑھ لوں گی" عصمت نے بیڈ پر پڑا ہوا عظلت کا
ایک زرتار دوپٹا اٹھا کر اسے سر پر پھیلاتے ہوئے
کہا تو عظلت چیخی۔
"نہیں نہیں۔ لاؤ میرا دوپٹا۔ لاؤ یہ مجھے دو" وہ اور
عصمت کی طرف جھپٹی تو عصمت دوپٹا لے کر بھاگنے لگی۔
عظلت بھی اس کے پیچھے بھاگی۔ دونوں بیڈ کے چاروں
طرف گھومنے لگیں۔
جینی اور صغیرہ بیگم کو عصمت کی اس شرارت پر ہنسی
آگئی۔ عظلت برابر میرا دوپٹا دے دو کی گردان کیے جا
رہی تھی۔ آخر صغیرہ بیگم نے عصمت کو ڈانٹا۔
"چلو اب آخر کب وہاں چلو گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ
تنگ آ کر آپا بیگم فضیحتہ کرتی ہوئی یہیں آ پہنچیں" ماں
نے کہا۔
تینوں لڑکیاں تیار ہی کھڑی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد

زندگی کم رہا تھا نہ غم روزگار۔ بچی کے سارے کام آیا انجام دیتی تھی۔ البتہ بی بی کو اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانا وغیرہ بلانا اور سلانا پڑتا تھا۔ چنانچہ دو تین ماہ تو اسے خود کو اس گھر میں ایڈجسٹ کرنے میں لگے۔ کیونکہ اس نے آہستہ آہستہ ہر چیز کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ یعنی اس نے خود کو بچی کو اور گھر کو ملازمین کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا تھا۔ بلکہ کھانا پکانے سے لے کر ہر کام اپنی مرضی سے کراتی تھی۔

گھر میں اتنے زیادہ دلچسپی کے سامان تھے کہ باہر گھومنے پھرنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہوتا کہ وہ بنگلے کے وسیع و عریض لان میں بینی کو لے کر ٹہلتی رہتی۔ اور کبھی کبھی اس کے ساتھ چھوٹے موٹے کھیل بھی کھیل لیتی تھی۔ بینی تو بس اس کی گرویدہ تھی۔ اس کے ہی اشاروں پر چلتی تھی۔ اور ہر دم اس کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ ماسوا باپ کے پاس جانے کے وہ اور کہیں نہیں جاتی تھی۔

مراد اسے ہفتے میں ایک بار ضرور اپنے پاس بلاتے تھے تو آیا اس کے ساتھ ہوتی تھی اور گھر کا ڈرائیور اسے مراد کے پاس لے جاتا تھا۔ یہ معمول ایک برس تک بڑی پابندی سے چلتا رہا تھا۔ پھر اس میں فرق پڑنے لگا۔

مراد اسے پندرہ دن میں ایک بار اپنے پاس بلانے لگے۔ اور پھر یہ وقفہ بڑھ کر مہینے ڈیڑھ مہینے پر جا پہنچا۔ آیا کی زبانی اسے ساری خبریں ملتی رہتی تھیں اور معلوم ہوا تھا کہ اب مراد زیادہ تر لندن میں رہنے لگے ہیں مگر اسے ان ساری باتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس کی معصوم سی بچی باپ کو یاد ہی نہیں کرتی تھی۔ البتہ جب باپ سے مل کر آتی تو دیر تک روتی رہتی اور آیا اس کے رونے کا سبب یہ بتاتی۔

"بیگم صاحبہ! اصل میں بے بی یہ چاہتی ہے کہ صاحب بھی اس کے ساتھ ہی یہاں آ کر رہیں۔ اس لیے اداس رہتی ہے۔"

"اچھا اگر یہی بات ہے تو پھر اپنے صاحب سے کہو کہ بے بی کو اپنے پاس بلا کر رکھ لیں۔ ویسے بھی اسے دو تین روز تو باپ کے ساتھ رہنا ہی چاہیے مگر وہ تو چند گھنٹے میں ہی اسے چلتا کر دیتے ہیں۔" اس نے جواب میں کہا تو آیا بولی۔

"نہیں بیگم صاحبہ! صاحب بھلا بے بی کو اپنے پاس کیسے رکھ سکتے ہیں۔ ایک تو وہ ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ دوسرے شام کو تو ان کے پاس میموں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ وہ۔۔۔ وہ کلموہی میمیں آدھی ننگی ناچتی ہیں۔ اب بے بی کو یہ سب دکھانا اچھی بات تو نہیں ہوتی نا بیگم صاحب جی۔" آیا نے بتایا۔

"اچھا تو تمہارے صاحب بھی۔۔۔"

"نہیں نہیں۔ صاحب نہ پیتے پلاتے نہیں ہیں بلکہ وہ تو ناچتے بھی نہیں ہیں۔ ہاں ان گوریوں کو دیکھ دیکھ کر آنکھیں ضرور سینکتے ہیں۔" آیا نے اس کی بات یا خیال کی تردید کرتے ہوئے بتایا تو وہ ہنس کر بولی۔

"تم بھی بہت بدھو ہو آیا۔ ورنہ تمہارے صاحب تو ہمیشہ سے ہی گوریوں کے دیس میں رہتے آئے ہیں۔ انہیں بھلا آنکھیں سینکنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔"

تو آیا کا دل چاہا کہے۔ جب انہیں آپ جیسی خوبصورت اور جوان بیوی کا پیار نہیں ملے گا تو وہ مجبور ہو کر دوسری عورتوں کو ہی تکا کریں گے۔ مگر وہ یہ سب کیسے کہتی بھلا۔ کہ بی بی آخر تو اس کی بارعب سی مالکہ تھی۔ وہ تو بس اس کی بات کے جواب میں سر ہلا کر رہ گئی۔ اور یوں ہوتے ہوتے ایک برس کا عرصہ گزر گیا۔

بینی تین برس کی ہو چکی تھی۔ اسے اب نرسری میں ڈالنا لازمی ہو گیا تھا۔ مگر مراد کی اجازت کے بغیر وہ بھلا کیسے بچی کو داخل کرا سکتی تھی۔ اور مشکل یہ تھی کہ مراد شاید وطن آئے ہی نہیں تھے کیونکہ انہوں نے عنیزہ کو کافی عرصے سے نہیں بلایا تھا۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ آیا سے اس کی وجہ پوچھے مگر آیا سے کچھ پوچھنا اسے اپنے وقار کے منافی لگا۔ اسی لیے عنیزہ کو اسکول میں داخل کرانے کے بجائے وہ گھر پر ہی اسے ابتدائی تعلیم دینے لگی۔

اس انتظار میں کہ جب بھی مراد نے بچی کو بلایا وہ آیا کے ذریعے بچی کو نرسری میں داخل کرانے کی اجازت لے لے گی۔ آخر دو ماہ بعد جا کر کہیں مراد سے اجازت لینے کا موقع ملا تو انہوں نے کہلوا دیا کہ نکاح کے وقت میں بے بی کے کل اختیارات آپ کو سونپ چکا ہوں لہٰذا کسی بھی معاملے میں مجھ سے اجازت لینے کی بالکل ضرورت نہیں۔ بڑا ہی کھردرا سا جواب تھا یا پھر اسے ہی لگا تھا بہرکیف۔

اس نے چند روز بعد ہی عنیزہ کو کراچی کے سب سے اچھے اسکول کی نرسری میں داخل کرا دیا۔ وہ عنیزہ کو دنیاوی تعلیم ہی نہیں بلکہ دینی تعلیم بھی دینے لگی۔ غرضیکہ اس نے اپنی تمام تر توجہ اور محبت بینی کو دے ڈالی تھی۔ اتنا عمدہ گھر ملا تھا تو اس کی اتنی قدر کی تھی کہ اسے آئینہ تمثال بنا کر رکھ دیا تھا۔ ڈرائیونگ سیکھنے کا ہمیشہ سے ہی شوق تھا چنانچہ اس نے باقاعدہ کار کورس (ڈرائیونگ انسٹرکٹر) سے رابطہ قائم کر کے ڈرائیونگ بھی سیکھ لی تھی۔ شروع شروع میں تو کار ڈرائیو کرتے ہوئے نروس ہو جاتی تھی۔ مگر جب ہاتھ تھوڑا کھل گیا تو بینی کو لے کر لانگ ڈرائیو پر بھی جانے لگی۔ یوں بھی کہا جاتا ہے کہ جو خواتین کمزور دل یا ڈرپوک قسم کی ہوتی ہیں ان کے اندر احتیاط اور ہمدردی کے جذبے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ مگر وہ تو بالکل ڈرپوک نہیں تھی۔ البتہ محتاط ضرور تھی۔ اور ہر کام ایک حد کے اندر رہ کر ہی کرتی تھی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اسے یہ جو آئی آسائشیں، آرام سکون محل نما گھر اور ڈھیر سارے اختیارات ملے تھے ان کے بارے میں سوچنا تو بڑی بات اس نے کبھی خواب میں بھی یہ سب نہیں دیکھا تھا۔ اس نے تو اپنی حقیقی زندگی میں اگر کچھ دیکھا تھا تو یہی کہ کھانے پینے سے لے کر لباس تک پہننے اوڑھنے میں روک ٹوک۔ کاموں میں عیب نکالنا۔ اس کی پڑھائی میں خلل ڈالنا۔ ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ۔ طعنے تشنے اور سوتیلی ماں۔ باپ اور رشتے داروں کی طرف سے نفرت ہی نفرت۔

کہاں کہ یہ ٹھاٹ۔

یہ آرام و آسائش۔

یہ خود مختاری اور آزادی۔ اور پھر اس کی ذاتی ملکیت خنل پیلس۔ گو اس کے نانا نے ان تینوں بھائی بہنوں کے نام کافی جائیداد کر رکھی تھی۔ اس پر باپ خود بھی صاحب جائیداد تھے۔ ماں نے اپنے مہر کی رقم تمام کی تمام بچوں کے نام سے بینک میں جمع کر رکھی تھی۔ اس پر کچھ زیورات بھی تھے۔ مگر خنل پیلس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ شاید اسی لیے وہ گم سی ہو کر رہ گئی تھی۔

بہرحال تقریباً ڈیڑھ سال تک تو زندگی ایک ہی ڈگر پر بسر ہوتی رہی۔ اس دوران میں وہ صرف گھر میں گھس کر نہیں بیٹھی تھی۔ بلکہ لانگ ڈرائیو اور شاپنگ پر جانے کے علاوہ وہ خلعت کے یہاں بھی جاتی رہی تھی اور اس سہیلی کے یہاں بھی جس کے یہاں کراچی پہنچ کر اس نے چند روز قیام کیا تھا۔ اس پر چند پڑوسیوں سے بھی اس نے خوشگوار تعلقات استوار کر لیے تھے۔ اس لیے اس کے گھر میں پڑوسیوں کی آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ مگر اس معاملے میں بھی اس نے ایک حد قائم کر رکھی تھی۔ یعنی وہ خلوص سے تو ملتی مگر اس کا انداز بہت لیا دیا سا ہوتا تھا۔ اس لیے خلوص میں زیادہ بڑھنے نہیں پاتی تھی۔

اس کی ایک اور سب سے بڑی وجہ یہ بھی کہ پڑوس کے بنگلوں سے جو بھی خواتین آتی تھیں وہ سب سے پہلے اس کے شوہر اور بینی کے باپ کی غیر موجودگی کے بارے میں ہی استفسار کرتی تھیں اور وہ ایک ہی بنا بنایا جواب دیتی تھی کہ بینی کے پاپا اپنا کوئی کورس مکمل کرنے انگلینڈ گئے ہوئے ہیں۔ بس کورس مکمل کرتے ہی واپس آ جائیں گے۔ مگر کورس مکمل کرنے کا وقفہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ مگر بینی کے پاپا کسی طرح واپس آ کر نہ دیتے تھے۔ اور ادھر پڑوسنوں کا تجسس بھی بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

برابر والے بنگلے میں ایک نیا جوڑا آباد تھا۔ شوہر سے تو اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ صرف بیوی ہی کبھی کبھی اس سے ملنے آ جاتی تھی۔ بڑی ہنس مکھ، اسمارٹ، الٹرا ماڈرن اور خوبصورت لڑکی تھی۔ ہنی اور اس کے درمیان جلد ہی دوستی قائم ہو گئی تھی۔ اور تھوڑی تھوڑی بے تکلفی بھی۔ ڈیفنس کے دستور کے مطابق دوسرے پڑوسی وغیرہ تو فون پر وقت مقرر کر کے ملنے آتے تھے مگر وہ جس کا نام انبساط تھا۔ وقت بے وقت جب دل چاہتا بے دھڑک اس کے یہاں آ جاتی تھی۔ اس سے بھی اس نے یہی کہہ رکھا تھا کہ اس کے شوہر امریکہ میں اپنا کورس مکمل کرنے گئے ہوئے ہیں۔ جونہی ان کا کورس مکمل ہو گیا وہ پاکستان واپس آ جائیں گے۔ شروع شروع میں تو انبساط نے اس کی بات پر یقین کر لیا تھا۔ مگر جوں جوں عرصہ دراز ہوتا جا رہا تھا وہ اس کی باتوں کو غلط بیانی پر محمول کرنے لگی تھی۔ وہ

پوچھتی۔

"آپ کے شوہر اگر اتنی دور بیٹھے ہیں تو وہ آپ کو خط تو ضرور لکھتے ہوں گے؟" اور وہ بغلیں جھانک کر کہتی۔

"وہ۔ وہ اصل میں مراد لکھنے کے بہت چور ہیں۔ ویسے بھی اپنی تعلیمی مصروفیات میں انہیں اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے کہ خط لکھیں۔"

"اچھا تو پھر فون پر بات کر لیتے ہوں گے۔ پتا ہے میرے بھائی جان بھی خط لکھنے کے بجائے فون پر بات کر لیتے ہیں۔ اس طرح آدھی ملاقات تو ہو ہی جاتی ہے۔" انبساط کہتی۔

"فون۔ ہاں۔ وہ فون پر تو بات کر لیتے ہیں۔" اسی لیے میں ان سے یہ نہیں کہتی کہ خط کیوں نہیں لکھتے۔" وہ تھوک نگل کر کہتی۔ اس کے جوابات انبساط کی تشفی کے لیے کافی نہیں ہوتے تھے۔ وہ موقع پا کر آپا سے بھی صاحب خانہ کے بارے میں پوچھتی رہتی۔ آپا بھی ہمیشہ گول مول سا جواب دیتی۔ دوسری پڑوسنوں کو بھی بھنک سی لگی رہتی۔ وہ آپس میں ملتیں تو یہی موضوع زیر بحث ہوتا۔ محلے میں یہ بات کافی مشہور ہو گئی تھی اور جیسے جیسے بیٹ اور ظرف کی خواتین ان سے بھی آ کر لگاتیں کہ فلاں فلاں خاتون تمہارے بارے میں ایسی باتیں کر رہی تھی۔

دراصل سب یہ سمجھنے لگے تھے کہ خنظل طلاق یافتہ ہے۔ اور شوہر سے اپنا مہر وغیرہ لے کر بیٹی کے ساتھ یہاں رہ رہی ہے۔ کچھ قیاس آرائیاں بہت نچلی سطح پر اتر کر اس کے بارے میں کی جانے لگی تھیں۔ جن سے اس کا کردار متاثر ہوتا تھا۔ اور انہی باتوں کی وجہ سے اس نے پڑوسنوں سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ عظمت کے یہاں آنا جانا بھی۔ کیونکہ وہ جب بھی عظمت کے یہاں جاتی تھی یا تو عصمت مذاق ہی مذاق میں اس پر گہری چوٹ کر جاتی تھی یا اس کی والدہ صغیرہ بیگم نصیحتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ جاتی تھیں۔

"اے تم تو خیر سے سہاگن ہو۔ لے تم صرف یہ گرمیے تو نہیں پہنا کرو۔ اپنے تو اپنی کلائیاں بھی سونی کر رکھی ہیں۔ اللہ رکھے مراد میاں کو مجھے تو بہت دکھ لگتا ہے اور یہ بچی تو وہ اپنی سونے کی چوڑیاں پہن لیا کرو۔" عظمت

فوراً ہی لقمہ دیتی۔

"مگر اپنی ذاتی چوڑیاں پہننے کی کیا ضرورت ہے مراد بھائی نے تو آپ کو چوڑیوں کے بیس بیس طلائی سیٹ دیے ہیں۔ ان میں سے ہی ایک آدھ پہن لیا کریں۔"

"ہاں واقعی بھابی جان۔ آپ نے بھی سادگی کی حد کر دی ہے۔ مجھے تو یہ سوچ کر ہراس کہ ہوتا ہے کہ اتنا قیمتی میک اپ کا سامان استعمال نہ کرنے کی وجہ سے پڑے پڑے خراب ہو گیا ہوگا۔"

عصمت فوراً کہتی۔ اس کی باتوں سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مراد کے مقابلے میں اس کی حیثیت کا احساس دلانا چاہ رہی ہو۔

"اے ہاں ہزار میاں سے دور رہتی ہو مگر ہو تو سہاگن ہی۔ برا ماننے کی بات نہیں۔ میں تو تمہاری ہی خیر خواہ ہوں۔ تمہیں اچھی اور کام کی باتیں ہی بتاتی ہوں۔ بیٹی اب تم یہ پابندیاں ختم کر دو۔ گھر کی زینت مرد اور عورت دونوں سے ہی مل کر بنتی ہے۔ تمہارے یہاں میں نے اسی لیے آنا کم کر دیا کہ مراد میاں کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے تمہارے گھر سے ایک ویرانی سی ٹپکتی ہے۔"

"ہاں ہنی۔ جنیفر بھی باپ کی کمی کو اب بہت محسوس کرنے لگی ہے۔" عظمت نے کہا۔

"ہاں مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ مراد اب دنوں بعد کراچی آتے ہیں۔ مگر بے بی نے آج تک میرے سامنے شکوہ نہیں کیا مراد کے نہ آنے کا۔" اس نے ساری باتوں کے جواب میں صرف اتنا کہا۔

"لیکن شکوہ کرنے یا نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ باپ کو مس تو بہت کرتی ہوگی۔" وہ اڑی بولی۔

"ہاں اٹس بٹ نیچرل۔ یہ تو ایک فطری بات ہوتی ہے نا۔" عصمت نے اپنا فلسفہ جھاڑا۔

اور وہ ان ماں بیٹیوں کی باتوں سے ایسی بیزار ہو گئی کہ جلد ہی وہاں سے کھسک آئی تھی۔ چلتے چلتے بھی صغیرہ بیگم نے کہہ دیا تھا۔

"بیٹی اب ذرا ہوش میں آ جاؤ۔ اور یہ اپنی ہٹ

ہٹ چھوڑ دو۔ مرد ذات کا کوئی اعتبار نہیں کہ کب اپنی روش بدل لے۔ اب تو مراد میاں بچی کی طرف سے بھی لاپروا ہو گئے ہیں۔ دو دو ماہ بعد آتے ہیں وہ بھی بس ڈاکٹر وزٹ پر۔ معاف کرنا بیٹی تم نے بھی اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے کہ اس کی ایک مجبوری کی وجہ سے اس کے سارے حقوق سلب کر لیے۔ اب تم یہ کہو کہ تمہارا تو اس میں کوئی قصور نہیں۔ تم نے تو نکاح سے پہلے ہی اپنی ساری شرائط ان کے سامنے رکھ دی تھیں تو میں اسے تمہاری نادانی اور طفلانہ پن ہی کہوں گی۔ یا پھر تمہاری بے حسی اور ہٹ دھرمی ورنہ آج تک تو ایسی کوئی نظیر ملی ہی نہیں کہ ایک منکوحہ اپنے شوہر سے اس قدر بیگانہ اور لاتعلق رہے۔"

اف بیچی کی باتوں نے تو اس کے تن بدن میں آگ سی لگا دی تھی۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ یہی بیچی تھیں جو بیٹی کے لیے اپنی آرزوؤں کی قربانی دینے پر اس کی تعریفوں میں رطب اللسان رہتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کی بیٹی کے ساتھ محبت اور شفقت کو ایک ایک کے سامنے سراہتی تھیں۔ حتیٰ کہ اس کے سلیقے سیرت اور صورت اور ایثار کرنے کی بھی تعریفیں کر کر کے اس کا منہ خشک ہوتا تھا۔ اب ان کے خیالات میں یہ اچانک تبدیلی کیسے آ گئی تھی؟

کیوں؟ آخر کیوں؟

یہ بدلے ہوئے خیالات ان کے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آئے تھے۔ وہ تو کچھ فطرتاً ہی سادگی پسند ہے اور یہ بات بیچی کو اچھی طرح معلوم تھی۔ اس پر بھی وہ اس کی سادگی پر چوٹ کر گئی تھیں۔ اور مراد اگر اپنی روش بھی بدل لیں گے تو اس کے لیے اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔ انہوں نے تو یہ شادی صرف اور صرف اپنی بیٹی کی زندگی بنانے کی غرض سے کی ہے اس کی محبت میں تو نہیں کی۔ پھر بھلا اس نے مراد پر کیا زیادتی کی کیا ظلم کیا۔ بلکہ الٹا اپنی ذات پر ہی ظلم کر بیٹھی بلاوجہ ہی اپنی آزادی سلب کر کے۔ حقوق تو اصل میں اس کے سلب ہوئے ہیں۔ پھر بھی یہ بیچی جان مورد الزام اسے ہی ٹھہرا رہی ہیں۔

وہ کئی روز تک یہی سوچ سوچ کر اپنا خون جلاتی رہی۔ اور اسی وجہ سے اس نے عظمت کے یہاں جانا بھی چھوڑ دیا۔ پھر بھی وہ اندر ہی اندر بے کل سی رہنے لگی۔

ان دنوں اس نے سب سے ملنا ترک کر دیا تھا۔ ملازمین سے کہہ دیا تھا کہ جو بھی ملنے آئے اس سے صاف صاف کہہ دینا کہ بیگم صاحبہ ملنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ کسی کا فون بھی آئے تو خود ہی سوال جواب کر کے بند کر دینا۔ ان دنوں تو جینی بھی اسے زہر لگنے لگی تھی۔ کیونکہ اس کی وجہ سے نکاح کا جوا گلے میں ڈال کر وہ اپنی آزادی سلب کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ جس کا اسے بہت غم تھا۔

ایک پچھتاوا سا پچھتاوا تھا۔

پشیمانی سی پشیمانی تھی۔

یوں بھی کچھ دنوں سے وہ اپنے اندر ایک ویرانی ایک خلا سا محسوس کر رہی تھی۔

یہ اتنا عالیشان گھر اور اس کی تمام تر آسائشیں۔ آرام اور خوبصورتی کسی خوبصورت قید خانے کی مانند لگنے لگی تھی۔ یوں تو یہ کچھ انسانی فطرت کا خاصا ہی ہوتا ہے کہ وہ کسی حال میں بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ برے حال میں ہوتا ہے تو خود پر مجبوری کا خول چڑھا کر صبر کا جامہ پہن لیتا ہے اور خود کو مظلوم بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور جسے ہر طرح کی نعمت حاصل ہوتی ہے اسے بھی کوئی نہ کوئی شکایت ضرور رہتی ہے۔

کوئی بے اولاد ہونے کے غم میں۔

کوئی کسی موذی مرض میں مبتلا ہونے کی پریشانی میں۔ کوئی تنہائی کا شکار ہونے کی علت میں۔ تو کوئی بچی خوشیاں ڈھونڈنے کی تلاش میں۔

اور وہ تو ماحول کی یبوست اور قید تنہائی سے ہی نہیں اپنے حالات بلکہ حالات زار سے سخت بیزار اور نالاں تھی۔ اسے یہ ساری آسائشیں اب ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔

آخر اس حماقت سے جو نکاح کی صورت میں مجھ سے سرزد ہوئی فائدہ ہی کیا ہوا۔ میں تو بہت بڑے خسارے میں پھنس کر رہ گئی ہیں۔ یہ نکاح مجھے میری

ویسے میں ڈال کر اس سے تو اچھا تھا کہ میں یہاں گورنس کے طور پر ہی ملازمت کر لیتی۔ اس طرح جب میرا دل چاہتا۔ میں یہاں کی ملازمت چھوڑ بھی سکتی تھی۔ مگر اب کوئی ساری عمر تو اس خوبصورت قید خانے میں بیٹھ کر نہیں گزاری جا سکتی۔ میرے تو یوں بھی بڑے اونچے اونچے عزائم تھے۔ بالخصوص سرد ترین ممالک کی سیاحت کا شوق۔ اور اس شوق کو پورا کرنے کا عزم۔ بچی کے لیے کوئی معقول سا بر ڈھونڈ کر اسے اس جہنم زدہ ماحول سے نکالنے کا عزم۔

حالات سے مل کر اس سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کے پر بات پڑتی۔ اور دوسرے بھی بہت سے ارادے جو مراد سے نکاح میں جکڑ جانے کے بعد دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ مگر اب اس نے اپنی ان تمام مشکلات اور مسائل کا حل ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ اور بس ایک ہی راستہ نظر آ رہا تھا۔ طلاق یا خلع۔

اور وہ اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھی کہ مراد تک طلاق کا مطالبہ کیونکر پہنچایا جائے۔ کسی کے ذریعے کہلانا مناسب معلوم ہو رہا تھا نہ خط کے ذریعے۔ وہ تو براہ راست خود مراد سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر مشکل تو یہ تھی کہ مراد کافی دنوں سے کراچی نہیں آئے تھے۔ اور بی بی کو اس نے جمعے سے ہی کہتے سنا تھا کہ صاحب نے کوئی نیا کام شروع کیا ہے اس لیے وہ کچھ دن بعد کراچی آئیں گے۔ اور اس کے لیے بڑے اچھے اچھے کھلونے اور چاکلیٹ لائیں گے۔ وہ ضد کرنے پر شاید بچی کو بہلا رہی تھی۔ مگر اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ جیسا ہونے کو آیا تھا۔ مگر مراد واپس نہیں پہنچے تھے۔

پھر اس دوران میں عظمت کے کئی فون آ چکے تھے جنہیں آپا ہی نے ریسیو کیا تھا۔ اور اس کو بتا بھی دیا تھا کہ عظمت بی بی کی بات کہیں طے پا گئی ہے۔ اور وہ کئی مرتبہ آپ کو فون کر چکی ہیں۔ مگر اس نے آپا کی بات پر کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن عظمت اور عصمت خود ہی چلی آئیں۔ ان کے ہمراہ نصیرہ بیگم ان کی منجھلی بہن فصیحہ بیگم اور ان کی دونوں بیٹیاں وجیہہ اور عائکہ بھی تھیں۔ اصل میں فصیحہ بیگم ہندوستان سے اور ان کی دونوں بیٹیاں نصیرہ بیگم کے ساتھ ملتان سے عظمت کی شادی میں شرکت کرنے آئی تھیں اور نصیرہ بیگم تو مراد کو مرحومہ بیٹی کا شوہر یا اپنا داماد نہیں بلکہ سگا بیٹا سمجھتی تھیں۔ سیدھا سادا حلیہ دیکھ کر انہوں نے

"ائے ہے یہ کیا درگت بنا رکھی ہے تم نے اپنی۔ کچھ نہیں تو کچھ پہن اوڑھ ہی لیا کرو۔ مجھے تو تمہیں یوں خالی خولی دیکھ کر بڑا رحم آ رہا ہے۔"

"ہاں واقعی۔ بڑا آئسولیٹڈ سا لگ رہا ہے اس گھر کا ماحول۔" عصمت فوراً ہی بولی۔

"تم تو بس خاموش ہی رہو۔ خواہ مخواہ ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کی عادت ہے تمہاری۔" عظمت نے اسے فوراً ٹوکا۔ اور عصمت برا منانے کے باوجود چپکی ہو گئی۔ وہ کبیدہ ہونے کے باوجود ان سب سے بڑے تپاک اور محبت سے ملی تھی۔ اور اس نے ان کی خوب آؤ بھگت بھی کی تھی۔ دن کے گیارہ بجے کے قریب یہ سب خواتین آئی تھیں اس نے فوراً ہی خانساماں کو ان کے لیے مزے دار کھانے تیار کرنے کی ایک لمبی فہرست دے دی تھی۔ اور آتے ہی لیمونیڈ کے ساتھ اسنیکس کے طور پر بھی کئی چیزیں پیش کر دی تھیں۔ عظمت کی شادی دو ہفتے بعد ہونے والی تھی اور انہوں نے اسے بڑے اصرار سے اس میں شرکت کرنے کے لیے کہا تھا۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ مراد اس کی شادی میں شریک نہیں ہو سکیں گے کیونکہ وہ آج کل اسٹیٹس میں ہیں۔ فصیحہ بیگم تو بس ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ انہیں بنی بہت پسند آئی تھی۔ وہ کھانا نکلوا کر ڈائننگ روم میں آئی تو کوریڈور سے گزرتے ہوئے اس نے سنا۔ نصیرہ بیگم اس کے بارے میں فصیحہ بیگم سے تعریف کرنے پر کہہ رہی تھیں۔

"ائے ہاں خوبیاں تو بہت ہیں مگر وہی مثل ہے کہ بے فیض اگر یوسف ثانی ہے تو کیا ہے۔ اے ہاں جو عورت شوہر کا خیال نہ رکھے۔ اس کے حقوق ادا نہ کرے بلکہ اسے سرے سے شوہر ہی نہ گردانے۔ وہ بھلا کہیں کسی تعریف کی مستحق ہو سکتی ہے۔ اور اس بے چارے بچے کی شرافت دیکھو۔ میرے بہت کہنے

سننے کی وجہ سے تو وہ کہیں جا کر عقد ثانی کے لیے راضی ہوا تھا۔ وہ بھی محض بچی کی بہبود کی خاطر۔ انہوں نے جو شرطیں رکھیں اس نے آنکھیں بند کر کے بے چون و چرا مان لیں۔ اور اس کا پتہ دیکھو کہ اب تک ان شرائط کو نبھاتا آیا ہے۔ مگر تا بکے۔ آخر مرد ہے مرد۔ اگر یہ اسی طرح اس کے صبر و ضبط کا امتحان لیتی رہیں تو وہ کوئی تیسری ڈھونڈے گا۔ یوں بھی بچی کو ان کے حوالے کر کے وہ بے فکر ہو گیا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن آپا بیگم آپ منجھلی آپا سے کہیں کہ وہ بنی کو سمجھائیں۔" فصیحہ بیگم بولیں۔

"اے انہوں نے سمجھانے میں کون سی کسر چھوڑی۔ مگر یہ ایک کان سے سنتی ہے دوسرے سے اڑا دیتی ہے بلکہ کچھ سنتی ہی نہیں۔ ابھی پچھلی مرتبہ صغیرہ کے سمجھانے بجھانے کا ایسا برا مانی کہ ان کے یہاں آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔ خیر بھئی ہمارا کیا ہے۔ ہم تو بھئی خواہ ہیں اچھا ہی چاہتے ہیں اب باقی تو یہ جانیں اور ان کا کام جانے۔"

نصیرہ بیگم نے جلے کٹے انداز میں کہا اور پھر اسے اندر آتا دیکھ کر فوراً ہی پینترا بدل کر بولیں۔

"ائے آؤ بہو۔ تم کیوں بے کار کے تکلف میں پڑ گئیں۔ ہم اس گھر کے لیے کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ میں نے سوچا تھا ملتان سے سیدھی یہیں آ کر ٹھہروں گی مگر منجھلی نے زبردستی اپنے یہاں ٹھہرا لیا۔"

صاف ظاہر تھا نصیرہ بیگم اس گھر میں مراد کی اہمیت کو جتا رہی تھیں۔ تلخ تجربات نے اسے چھوٹی سی عمر میں ہی بہت سمجھدار اور حساس بنا دیا تھا۔ وہ برا مانے بغیر ہنس کر بولی۔

"چلیں اگر چچی جان نے اب آپ کو زبردستی اپنے یہاں ٹھہرا لیا ہے تو عظمت کی شادی کے بعد آپ یہاں اپنے گھر میں آ کر ٹھہر جائیے گا۔ واقعی اپنا گھر ہوتے ہوئے کسی اور کے یہاں رہنا کچھ مناسب تو نہیں لگتا۔"

آخری فقرہ اس نے اپنی بات کی تائید چاہنے کی غرض سے فصیحہ بیگم کو مخاطب کر کے کہا۔

"ہاں مگر آپا بیگم مستقل طور پر تو یہاں نہیں رہ سکتیں پر تو منجھلی آپا کے یہاں بھی چند ہفتے ہی قیام کر سکیں گی۔ ورنہ ان کے جیٹھ کی اولاد میں ان کی زمینوں کو نوچ کھائیں گی۔"

فصیحہ بیگم نے جواب میں تھوڑا سا ہنس کر کہا۔

پھر سہ پہر کی چائے پینے کے بعد نصیرہ بیگم نے بہن اور بھانجیوں کے ساتھ واپسی کے ارادے سے اٹھتے ہوئے ایک بار پھر در افشانی کی۔

"دیکھو بہو۔ تم ماشاء اللہ پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہو۔ تم نے دینیات بھی پڑھی ہو گی۔ ویسے دوسرے مذاہب میں بھی عورت پر شوہر کے حقوق ادا کرنے کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ اور دنیا کا کوئی بھی مرد اتنے عرصے ڈھائی برس تک اپنے حقوق کا اس بری طرح خون نہیں کرا سکتا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں مراد میاں کوئی اور سہارا نہ تلاش کر لیں۔"

"جی ہاں خالہ بیگم یوں بھی اڑتی اڑتی سی ایک خبر سنی ہے کہ۔"

عصمت نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہنا چاہا تو عظمت نے فوراً اسے ٹوکا۔

"یہ اڑتی اڑتی سی خبر کیا ہوتی ہے بھئی کیا تمہاری یہ ہر بات میں ٹانگ اڑانے کی عادت کبھی نہیں جائے گی۔"

"اوہو آپ تو بس میری زبان پکڑنے کا موقع تلاش کرتی رہتی ہیں۔ ورنہ میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی۔ اڑتی اڑتی وہ خبر ہوتی ہے جس کے بارے میں پورے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہی میرا مقصد تھا اور میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ میں نے بھی کچھ ایسی خبر سنی ہے مراد بھائی کے نئے پارٹنر تلاش کرنے کے بارے میں۔" بہن کے ٹوکنے پر عصمت نے چڑ کر اپنی بات کی وضاحت کی۔

"اگر ایسی بھی کوئی بات ہے تو اس سے میری صحت پر کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ خیر کزن تم اطمینان رکھو۔" بنی نے اس کی بات کو مذاق میں اڑاتے ہوئے کہا تو وہ ساری خالہ بھانجیاں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

"خیر اس کی تو بچکانہ باتیں ہوتی ہیں مگر بیٹی تم ذرا ٹھنڈے دل سے اس معاملے پر غور کرو۔ کیونکہ اب یہ مذاق اور جذباتی حدود پار کر کے بہت سیریس معاملہ

بن چکا ہے۔" فیضو بیگم نے بھی اس کے اس معاملے میں دخل دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بہو۔ یوں بھی تم جیسی جوان لڑکی کا اتنے بڑے گھر میں تنہا رہنا ٹھیک نہیں۔ لے دے کے یہاں تو کوئی رونق ہے نہ چہل پہل۔ آج کل تو دن دہاڑے ڈکیتیاں پڑ رہی ہیں۔"

نفیسہ بیگم طرح طرح کے خدشات ظاہر کر کے اسے کسی نہ کسی طور مراد کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے آمادہ کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی باتوں کی اس گہرائی پر اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"ارے نہیں خالہ بیگم۔ میرا تو رب سے بڑا محافظ میرا اللہ ہے۔ بھلا کس لٹیرے ڈاکو کی مجال ہے جو میرے گھر کا رُخ کرے گا۔ رہی تنہا رہنے کی بات تو یہ اتنے سارے ملازم ہیں جو ہر وقت مستعد رہتے ہیں اور بے بی بھی میرے ساتھ ہی رہتی ہے اور آیا بھی ہے۔"

"ارے نوکر چاکروں کے ساتھ رہنے سے بھلا کیا ہوتا ہے۔ وہ تو خدمت بجا لانے پر مامور ہوتے ہیں۔ کوئی سہیلیاں دوست تو نہیں ہوتے۔ اور شادی کے بعد تو عورت کے لیے صرف شوہر ہوتا ہے۔ شوہر۔" نفیسہ بیگم نے جلے کٹے سے انداز میں کہا تو فیضو بیگم بھی جل کر بولیں۔

"ارے چھوڑو بھی آپا بیگم۔ یہ ماشاء اللہ اتنی سمجھدار ہو کر جب نہیں سمجھتیں تو آپ کے کہنے سننے سے فائدہ۔ چلیے اب چلیں آپ کے یہاں چلیں۔ وہاں کافی مہمان جمع ہو گئے ہوں گے۔"

"اوہاں واقعی۔ ہم تو تھوڑی دیر کے لیے ہی آئے تھے اور یہاں پورا دن گزار دیا۔ اب تو جانا ہی چاہیے۔" عصمت بولی تو چلتے چلتے عظمت نے بھی تاکید کی۔

"دیکھو ایسے نہ بیٹھی رہنا۔ ایک دو دن تو ہمارے یہاں رہنے کے لیے آ جانا اور ہاں خوب ڈیک اپ ہو کر آنا۔ ورنہ پھر خالہ بیگم پھر سب کے سامنے نصیحتیں کرنے نہ بیٹھ جائیں۔" تو اس نے جواب میں مسکرا کر کہا۔

"اچھا بھئی تم اطمینان رکھو۔ تمہاری شادی میں جس کیل کانٹے سے لیس ہو کر آؤں گی۔"

پھر وہ سب چلی گئیں تو ان کے جانے کے بعد اسے ایک ہی بات یاد رہ گئی۔ نہ معلوم اس میں کچھ صداقت بھی تھی یا نہیں۔ مگر نفیسہ بیگم نے مراد کے بارے میں جو اسے ایک طرح کی دھمکی دی تھی۔ کہ اگر مراد کے ساتھ اس نے اپنے رویے میں تبدیلی پیدا نہیں کی تو وہ تیسری شادی کر لیں گے۔ اس پر وہ فکرمند اور پریشان ہونے کے بجائے دل میں خوب خوب ہنسی۔ "ہونہہ اگر تیسری شادی کرنا چاہ رہے ہیں تو بخوشی کر لیں۔ بہادر کے جیتے جی میں تو پہلے ہی ان کے سامنے طلاق کا مطالبہ رکھنے والی تھی۔ قدرت نے خود ہی اس کا موقع فراہم کر دیا۔ بے شک مراد مجھ سے یہ ساری آسائشیں چھین لیں مجھے اس گھر سے نکال دیں مگر میں اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی۔"

اس نے واقعی پوری قطعیت کے ساتھ یہ تہیہ کر لیا تھا۔ اس گھر سے بھی اب اسے وحشت سی ہو گئی تھی۔ جینے کی ذات میں تو اس نے پہلے سے ہی دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ بس کسی نہ کسی طرح اپنا وقت کاٹ رہی تھی۔

دل کی ویرانی کچھ اتنی بڑھ گئی تھی کہ عظمت کی شادی میں شرکت کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن چونکہ ہالک یہ پہلی خوشی تھی۔ پہلا کار تھا اور اس کی اتنی پیاری سی دوست عظمت کی شادی تھی۔ وہ بھلا اس میں کیسے شرکت نہ کرتی۔ اس نے تو عظمت کے لیے ایک نفیس و نازک سا طلائی سیٹ اور اس کے شوہر کے لیے طلائی لنکس بھی خرید لیے تھے۔ اور خاصی ڈیک اپ ہو کر اس کی مایوں اور مہندی کی رسموں میں شریک ہوئی تھی۔ اور شادی والے روز تو نفیسہ بیگم نے بہت کہہ سن کر اسے اس کا عروسی جوڑا جسے پہننے کی اب تک نوبت نہیں آئی تھی اسے پہنوایا تھا۔ اس پر مراد کی طرف کا بھاری طلائی جڑاؤ سیٹ بھی اس نے پہنا تھا۔ اور خود ہی ہلکا پھلکا میک اپ بھی کیا تھا۔ اور عائکہ نے اس کی سج دھج دیکھ کر کہا تھا۔

"اوہ۔ ماشاء اللہ دلہن تو اصل میں آپ لگ رہی ہیں اس وقت۔" عصمت و عظمت نے بھی اس کی بات کی تائید کی تھی اور اسے خوب خوب ستایا تھا۔ شادی

بڑی دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ بڑی تعداد میں مہمان مدعو تھے۔ نکاح اور رخصتی بلکہ ڈنر شیرٹن میں ہونا قرار پایا تھا۔ وہ شیرٹن جانے کے لیے تیار ہی کھڑی تھی۔ عصمت بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی اور پھولے پھولے سانسوں کے ساتھ بولی۔

"وہ۔ وہ خنکل آیا۔ وہ مراد بھائی آئے ہیں۔" تو وہ بری طرح چونکی کہ اس کا چہرا متغیر سا ہو گیا۔ بڑے طیش کے عالم میں اس نے کہا۔

"تو گویا تم لوگوں نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے بچہ دیا تھا کہ مراد عظمت کی شادی میں شریک نہیں ہوں گے۔ تم لوگ کیسے جھوٹے دار ہو۔ تمہاری تو ساری باتیں جھوٹ ہوتی ہیں۔"

"اُف وہ۔ آپ پوری بات تو سن لیجیے۔ مراد بھائی آپ کی شادی میں شریک ہونے کے لیے نہیں آئے۔ وہ تو ابھی سہ پہر کی فلائٹ سے واپس جا رہے ہیں۔ اور وہ بے بی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ انہوں نے آیا کو اس کا سامان لینے بنگلے پر بھیجا ہے۔ اور بتایا ہے ان کی وہ گرل فرینڈ بھی ان کے ساتھ آئی ہے جس سے وہ تیسرا نکاح کرنے والے ہیں۔"

"ہیں۔" اسے یوں لگا جیسے یہ بتا کر عصمت نے اس کے دل پر گھونسا سا مار دیا ہو۔ یعنی کہ تیسری شادی کے معاملے میں مراد واقعی سیریس ہیں۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ کم از کم میری موجودگی میں تو ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے گھڑی کی چوتھائی میں وہیں بیٹھے بیٹھے سوچا اور پھر اچانک ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کہاں ہیں وہ؟" اس نے بڑے جذبے کے عالم میں عصمت سے پوچھا۔

"کون بھابی جان؟ کیا یعنی؟" عصمت نے اس کے ادلتے بدلتے تیوروں کو دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں دی ایڈیٹ شخص۔ مراد۔" وہ انتہائی طیش کے عالم میں بولی۔

"وہ۔ نیچے گیسٹ میں بیٹھے ہوں گے کیونکہ وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہی کھڑے تھے۔"

مگر اس نے عصمت کی پوری بات ہی کب سنی۔ وہ تو کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح تیزی سے سیڑھیاں اتر کر گیسٹ روم میں پہنچ گئی۔ غصے کے عالم میں اس نے دروازے پر دستک بھی نہیں دی تھی۔ ایک جھٹکے سے عالم میں دروازے کو زور سے دھکیلا تو دونوں پٹ باآواز کھل گئے۔

وہ گیسٹ روم میں دندناتی ہوئی تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس توقع کے ساتھ کہ کمرے میں مراد اور ان کی گرل فرینڈ کو وہ رنگے ہاتھوں پکڑے گی۔ مگر کمرا تو خالی پڑا جمائیں جمائیں کرتا نظر آیا۔ یا پھر دوسرے معنوں میں اس کا منہ چڑاتا نظر آیا۔

وہ اپنے تیزی سے چلتے ہوئے تنفس کے ساتھ کچھ دیر تو کھڑی کمرے میں ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ صاف ظاہر تھا اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ مراد اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ جا چکے ہیں۔ اس خیال نے تو اسے اور بھی مشتعل سا کر دیا۔ اس نے سوچا مراد اپنی گرل فرینڈ اور بے بی کو لے کر بے بی کا سامان لینے یقیناً ڈیفنس گئے ہوں گے۔ مجھے وقت ضائع کیے بغیر فوراً ڈیفنس پہنچنا چاہیے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بجلی کی سی سرعت سے ... کے لیے تیزی سے لپکی کہ سامنے داخل